Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

3735

ذکرِ سیدین

خواجہ غلام السیدین۔ شخصیت و افکار

1490

उर्दू संग्रह

पुस्तक का नाम ज़िक्र सय्यदैन

लेखक प्रामसी तोहरानी

प्रकाशन वर्ष 1975

आमत संख्या 1490

۹۔ منٹو سرکل کوارٹرس سیکولر فورم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

पुस्तकालय

गुरुकुल कंगडी विश्वविद्यालय हरिद्वार

वर्ग संख्या -- -- -- -- आगत संख्या - ----

पुस्तक - वितरण की तिथि नीचे अंकित है । इस तिथि सहित 15 वें दिन तक यह पुस्तक इ पुस्तकालय में वापिस आ जानी चाहिए । अन्यथा 15 पैसे के हिसाब से विलम्ब - दण्ड लगेगा ।

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ओ३म्

पुस्तक संख्या 1490

पञ्जिका संख्या .....

पुस्तक पर सर्वं प्रकार की निशानियां लगाना वर्जित है। कोई सज्जन पन्द्रह दिन से अधिक देर तक पुस्तक अपने पास नहीं रख सकते। अधिक देर तक रखने के लिये पुनः आज्ञा प्राप्त करनी चाहिये।

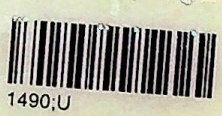

गुरुकुल कांगड़ी विश्वविद्यालय
कृपया पुस्तक के ऊपर कोई निशान आदि
न लगायें।

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ب

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

1490
जकर सईदन
3735

ذکرِ سیّدین

ख्वाजा गुलाम उल सईदन

خواجہ غلام السیّدین۔ شخصیت و افکار

सरवलीयत वफकार

Forwa
From the
the

लेखक- शमसी तहरानी

مصنّف

شمسی طہرانی

1490,U

Forwarded With Compliments
From the Department of Culture
Government of India

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

تعارف:

نام: ایچ۔ ایم۔ ضیاء الدین
تعلیم: ایم۔ اے۔ انڈین ہیومینٹیز (گولڈ میڈلسٹ) علیگڈھ
ایم۔ اے۔ فارسی (گولڈ میڈلسٹ) "
ایل۔ ایل۔ بی (مولوی عالم۔ الہ آباد) ۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر:
فکر و نظر سہ ماہی شعبۂ اردو۔ علیگڈھ

اشاعت اول ستمبر ۱۹۷۵ء
تعداد: ۶۰۰
قیمت: ۱۰ روپے
مطبع: اعلیٰ پریس، بیماران دلّی ۶
پبلیشر: مصنف

ملنے کے پتے:
۱۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دلّی
۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ۔ علیگڈھ (یو۔ پی)

یہ کتاب اتر پردیش اردو اکیڈیمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے طبع ہوئی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ذکرِ سیّدین

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

DEDICATION

To Mrs. Indira Gandhi, the Prime Minister of India and saviour of mankind, whose constructive and bold steps recall to mind the age-old verses of the great persian poet, Nizami Ganjawi, — Verses wherein Naushaba administers a befitting reply to Alexander, whom she atonce recognises; although he pretends to appear before her as an emissary rather than a sovereign himself :

اگرچہ زنم زن سیر نیستم - ز کار جہاں بے خبر نیستم

منم شیر زن گر تو ئی شیر مرد - چہ مادہ چہ نر شیر وقت نبرد

چو بر جوشم از خصم چون تند میغ - در آب آتش انگیزم از برق تیغ

Although I am a woman (by accident of birth) but my inherent characteristics are otherwise, and I am not oblivious of what is going on around me on this planet,

If thou art a lion-hearted man, I am no less a lion-hearted woman; and during the course of an encounter, sex discrimination matters not.

When I shoot forth towards enemy like a thundering cloud, I produce fire on the expanse of water with the flash of sword.''

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

انتساب

محبۂ انسانیت محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند
کے نام جن کے جرأت مندانہ اقدامات فارسی کے عظیم المرتبت شاعر نظامی
گنجوی کے اُن اشعار کی یاد دلاتے ہیں جن میں نوشابہ نے سکندر کو بے نقاب
کیا ہے ؎

اگرچہ زنم زن سریر نیستم ۔ ترکار جہاں بے خبر نیستم
منم شیر زن گرچہ شیر نر ۔ چہ ماده چہ نر شیر وقت نبرد
چو بر جوشم از خصم چوں تند میغ ۔ در آب آتش انگیزم از برق تیغ

(رفتن سکندر نزد نوشابہ بلیاس سفارت۔ سکندر نامہ ص ۵۹ مطبع مصطفائی)

(ترجمہ) "اگرچہ میں عورت ہوں لیکن میری سیرت و کردار عورتوں سے مختلف
ہے۔ میں دنیا کے معاملات و مسائل سے بیگانہ نہیں ہوں۔ مانا کہ تو شیر مرد
ہے لیکن میں بھی شیر زن ہوں اور آویزش کی صورت میں امتیاز جنس بے
معنیٰ ہے۔ جب میں گرجتے ہوئے بادل کی مانند دشمن پر غضبناک ہوتی ہوں
تو تلوار کی بجلی سے پانی میں آگ لگا دیتی ہوں۔"

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

فہرست

۱ انتساب

۲- پیش لفظ — ہز اکسیلنسی پروفیسر خلیق احمد نظامی

۳- مقدمہ — پروفیسر محمد حلیم خاں

۴- تمہید

۵- سیدین کا خاندان، تعلیم اور ملازمت۔

۶- وردھا اسکیم کی سربراہی، مختلف مناصب اور خدمات۔

۷- مسلم یونیورسٹی اور دیگر مذہبی، علمی اور ادبی انجمنوں سے دلچسپی۔

۸- بے نیازی۔ مبلغ علم اور اسلوب نگارش۔

۹- ابوالکلام و اقبال سے عقیدت۔

۱۰- مختلف بانیان مذاہب کے افکار کا تقابلی مطالعہ۔

۱۱- گاندھی جی سے عقیدت۔ جواہر لال سے محبت اور ذاکر صاحب سے رابطہ

۱۲- مختلف تعلیمی اور دیگر موضوعات پر سیدین کے افکار

۱۳- پاکستان سے سب سے بڑی شکایت۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

0785

۱۴۔ مسز اندرا گاندھی سیدین کی نظر میں
۱۵۔ اسلام میں ظلم کی مذمت۔
۱۶۔ مشرقی بنگال کا مسئلہ اور پاکستان۔ سیدین کے نقطۂ نظر سے
۱۷۔ سیدین ایک ہمعصر شاعر اور اپنے احباب کی نظر میں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پیش لفظ

ہز اکسیلنسی پروفیسر خلیق احمد نظامی
سفیر ہند برائے شام (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

علی گڈھ کو اپنے جن فرزندوں پر بجا طور پر فخر و ناز ہو سکتا ہے ان میں خواجہ غلام السیدین کی شخصیت بعض اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔ وہ "زندہ دلان پنجاب" کے اس خاندان کے گل سرسبد تھے جس نے سرسید کی آواز پر دل و جان سے لبیک کہی تھی۔ وہ خود علی گڈھ کے طالب علم بھی رہے اور معلم بھی اور ان دونوں حیثیتوں میں اپنا ایک امتیازی مقام پیدا کیا۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ استاد کی ساری خوبیاں ان کے مختصر سے پیکر میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں۔ ان کی سیرت کی دلنوازی، فکر کی تابندگی اور شیریں گفتار پہلی ہی ملاقات میں دل کو موہ لیتی تھی۔ کچھ دیر گفتگو کیجئے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی اعلیٰ قدریں، ان کی راہ فکر کو در تک چراغوں کی طرح روشن کئے ہوئے ہیں اور ان کے اندر معلم کی ایک بے چین روح متحرک ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ط

ہر جگہ ایک ایسے معلم کے روپ میں نظر آتے ہیں جو کبھی قرآن سے روشنی حاصل کرتا ہے، کبھی اقبال کے اشعار سے دل کو گرماتا ہے کبھی مہاتما گاندھی کے نقش پا تلاش کرتا دور تک نکل جاتا ہے۔ مغرب کے کارناموں سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اپنی مشرقی قدروں کو دل و جان سے عزیز رکھتا ہے۔ سیّدین صاحب کی شخصیت اور ان کے افکار دونوں میں بڑی دلآویزی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولانا شمسی مہرانی نے ان کی شخصیت اور افکار کو خود ان کے نگارشات کی روشنی میں بڑے دلچسپ انداز میں اور بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور مقبول ہو گی۔

خلیق احمد نظامی

دمشق ۷ رمئی ۱۹۷۵ء

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

مقدمہ

(پروفیسر محمد حلیم خاں صدر شعبۂ تعلیمات علیگڈھ مسلم یونیورسٹی
و ٹریننگ پروفیسر انسٹی ٹیوٹ آف اکالوجی بندونگ (انڈونیشیا)

سیدین صاحب کے بارے میں جیسے ہی خیال آتا ہے چالیس سال پیشتر کی زندگی اور ٹریننگ کالج کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ علیگڈھ کے ٹریننگ کالج کی آبرو جن افراد سے قائم رہی ان میں سیدین صاحب پیش پیش ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھی حبیب الرحمٰن صاحب، تجمل حسین صاحب، ہاشمی صاحب، چودھری عبدالغفور صاحب، سب کی جلتی پھرتی تصویریں بننے بگڑنے لگتی ہیں ان لوگوں نے اپنے تن من سے اس کالج کی آبیاری کی اور اسکی شان بڑھانے میں خون پسینہ ایک کیا۔

سیدین صاحب ہندوستانی تہذیب کی علامت تھے ان کے یہاں قدیم و جدید کا بڑا حسین امتزاج تھا۔ ان کی شخصیت کی دمک ان کے رکھ رکھاؤ کی آب و تاب سب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ وہ خود اہل علم تھے اور اہل علم سے محبت کرتے تھے اسی لیے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں خیال اور عمل

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ایک ساتھ آیا کرتے تھے۔

سیّدین صاحب نے اپنی عمر میں ان گنت کام کئے کتابیں لکھیں۔ انگریزی اور اُردو دونوں میں۔ دونوں ہی میں ان کی حیثیت منفرد ہے۔ آج وہ نہیں ہیں لیکن ان کے جاننے والے ان کی صورت کبھی نہیں بھول سکتے۔ وہ جب بھی تہذیب، شرافت، نیکی، درد مندی اور انسان دوستی کو یاد کریں گے تو سیّدین صاحب کی شکل ان کی آنکھوں میں پھر جائے گی۔ یہ تمام انسانی قدریں علیحدہ علیحدہ مل جاتی ہیں لیکن ان کا کسی ایک انسان میں جمع ہونا بڑی بات ہے آج ان کی یاد کے ساتھ چالیس سال پہلے کا علیگڈھ یاد آتا ہے۔ وہ جس زمانہ میں علیگڈھ میں رہے وہ علیگڈھ کا عہد زرّیں تھا۔ یہ عہد زرّیں پھر دوبارہ نہ آیا۔ ان کے ساتھ جن لوگوں نے کام کیا ہے یا جنھوں نے انھیں کام کرتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں جرأت اقدام کی کمی نہ تھی جو اعتماد اور حسنِ تدبیر ان میں دیکھنے میں آیا وہ کم لوگوں کو نصیب ہے۔

۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری قبول کرنے کا ارادہ کیا تو گاندھی جی نے سب سے پہلے تعلیمی کام پر توجہ دی۔ اس وقت کے نظام تعلیم میں جس انقلاب کے لانے کی ضرورت تھی اس کا احساس جن افراد کو تھا ان میں اس زمانے کے علی گڈھ ٹریننگ کالج کے نوجوان بھی تھے جن میں علم، عزم اور جرأت کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کمی نہ تھی - وار دھا اسکیم بنی - ذاکر صاحب نے دست راست کا کام انجام دیا - اسکیم مرتب کی گئی اور صوبائی کانگریسی حکومتوں کو عمل درآمد کے لئے پیش کی گئی - اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلی کی جائے اور ایک ایسا منصوبہ مرتب کیا جائے جو کہ بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکے - ان میں صنعت و حرفت کا رجحان پیدا ہو سکے اور اخراجات کا بوجھ بھی کم سے کم پڑے اس اسکیم میں سب سے اہم کام نصاب کی ترتیب کا تھا - اس اسکیم کا مقصد علم و عمل اور جسم و دماغ میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا یہ بات شاید بہت کم افراد کو معلوم ہے کہ اس نصاب کی ترتیب کا کل کام علیگڈھ ٹریننگ کالج کے سپرد کیا گیا تھا اور اسکی تیاری کی سربراہی کی ذمہ داری سید ین صاحب کو دی گئی تھی حبیب الرحمٰن صاحب، عبدالغفور صاحب، تجمل حسین صاحب اور قنبر حسین زیدی صاحب سب نے جو ٹیم ورک کیا وہ دیکھنے کے لائق تھا اور آخر کار اس اسکیم کے مقاصد - تعلیمی ڈھانچے کی ترتیب کا خاکہ مرتب کر کے ذاکر صاحب کو پیش کر دیا اور یہ خاکہ اسی طرح عمل کی کسوٹی پر کسنے کے لئے پیش کر دیا گیا - یہ اسکیم کامیاب کیوں نہ ہوئی اس کی وجوہات کا جائزہ لینا ایک الگ بات ہے - لیکن آج جب ثانوی درجہ کی تعلیم کی طرف توجہ دی جا رہی ہے اور نئی نئی اسکیمیں سامنے آ رہی ہیں تو بھی اسکی روح کو نظر انداز

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

نہیں کیا گیا۔ آج بھی WORK EXPERIENCE کے نام سے جو کام لیا جائے گا وہ اسی اسکیم کا ایک پرتو ہے اس کی اہمیت اور افادیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا میں دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں اکثریت تو ان کی ہی جو "لینے" کے قائل ہیں اپنی ذات کے لئے سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن بہت تھوڑی تعداد ان کی ہے جو "دینا" چاہتے ہیں جو کچھ بھی "مادی دولت" یا "دل کی دولت" ہے اسے لٹانا چاہتے ہیں۔ اس زمانہ کے کالج کا یہ گروہ دوسرے ہی طبقہ سے متعلق تھا جنھوں نے تعلیم کو ایک بنیادی عمل سمجھا وہ بنیادی عمل جس کے بغیر زندگی کی بہترین اقدار پیدا نہیں ہو سکتیں اس کے لئے تعلیم کے ایک وسیع نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر۔ اور سیّدین صاحب میں یہ سب باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

فکری طور پر بھی دنیا ہمیشہ دو گروہوں میں بٹی رہتی ہے۔ ایک وہ جو حال کی قدروں کو ابدی یا حقیقی جان کر ان پر قائم رہنا چاہتے ہیں یا ان کی جگہ ان سے زیادہ دقیانوسی اور غیر حقیقی قدروں کو مسلط کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جو مستقبل کی نئی قدروں کے علمبردار ہوتے ہیں اور پرانی قدروں کے کھوکھلے پن کو سامنے رکھ کر نئی زندگی کا پرچم کھولے رہتے ہیں۔ سیّدین صاحب نے ہمیشہ نئی مشعل روشن کی اور وہ ایک مثالی معلّم تھے۔ ماہر تعلیم تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک لطیف انشاء پرداز۔ انشاء پرداز کی حیثیت سے انھوں نے "لفظوں کو حسن میں سمو کر استعمال

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کرنے کی کوشش کی" انھوں نے "تمام عمر لفظوں کو نرمی صداقت اور جرات کے ساتھ استعمال کیا ہے" انھوں نے ایک لفظ کو "حق کی حمایت کے لئے تلوار" بھی سمجھا اور "زخم کے لئے مرہم" بھی۔

ان کی زندگی کا پیغام یہی تھا کہ ایک دوسرے سے محبت کرو انھیں اپنے دل کی نرمی و گرمی میں جگہ دو اور ان کے ساتھ بھلائی کرو۔

آج سیدین صاحب کی یاد آئی تو بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا۔

مفر و رہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے!

سیدین صاحب کی یاد کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور اسکی ریاضت یاد آتی ہے، بہت زمانہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ سیدین صاحب پر سیر حاصل کام کیا جائے اور وہ بھی علی گڈھ میں ہو۔ آج مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ذکر سیدین کے نام سے یہ کتاب سامنے آرہی ہے، شمسی طبرانی علی گڈھ کے ان نوجوان اہل علم میں سے ہیں جنھوں نے علی گڈھ کی لاج رکھنے ہمیشہ کوشش کی۔ انھوں نے اس کتاب میں سیدین صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ تو لیا ہی ہے ایک طرح سے ان کے علم و فکر پر بھی تحقیق کر ڈالی ہے۔ وہ عربی فارسی اور تاریخ تینوں کے عالم ہیں اور ہمیشہ امتیازی حیثیت کے مالک رہے ہیں ان کی یہ محنت لائق ستائش ہے اور وہ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے علی گڈھ کے اس

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

س

نابغۂ عصر فرزند پر قلم اٹھایا -

محمد حلیم خاں - صدر شعبۂ تعلیمات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۷ ستمبر ۱۹۷۵ء

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

از شمار دو چشم یک تن کم وز حساب خرد ہزاراں بیش (رودکی)

ہندوستان کے جامع الحیثیات اہل علم کی اگر چھوٹی سے چھوٹی کوئی فہرست مرتب کی جائے تو عہد وسطیٰ میں امیر خسرو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح عصر حاضر میں خواجہ غلام السیدین کا اسم گرامی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ بیک وقت ادیب بھی تھے، مقرر بھی اور معلم بھی۔ ان کے مطالعہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ تاریخ فلسفہ، ادب، سائنس، نفسیات، تہذیب و تمدن، تقابلی مطالعہ مذاہب (RELIGION COMPARATIVE) سوشیولوجی، اخلاقیات، مصوری اور موسیقی وغیرہ ان سبھی علوم و فنون سے انھیں دلچسپی تھی۔ جس کا مظاہرہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے ہوتا تھا۔ وہ خود مطالعہ کی وسعت اور تنوع پر زور دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ:

"آج کل زمانے میں "اختصاص" کی تحریک ہماری علمی اور ادبی زندگی اور مذاق کو تیزی کے ساتھ مفلس بنا رہی ہے۔ (ایک عہد ور دیش ص ۱۱)

اس ہمہ جہتی مطالعے اور ہمہ دانی کے باوجود ان کی عاجزی اور انکساری کا یہ عالم

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تھا کہ وہ کبھی اپنے کسی ملنے والے پر اپنی برتری کا اظہار تک نہیں کرتے تھے۔ مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور مختلف مکاتیب خیال کے افراد جب ان سے ملتے تو انھیں کے ہو جاتے دیکھنے والا یہ منظر دیکھ کر کہہ اٹھتا تھا ؎

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند دور تو پیوستند

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنی نظر میں بلندی، ذہن میں روشنی، دل میں فراخی، فکر میں گہرائی اور سخن میں دلنوازی پیدا ہی نہیں کر سکتا جب تک وہ اچھا آدمی بھی نہ ہو۔ حالی نے جو لفظ آدمیت کی تعریف کی تھی۔ سیدین صاحب اس کا صحیح مصداق تھے۔ وہ زندگی بھر انسانیت کی عالمگیر شریف قدروں کی خدمت اور اشاعت کرتے رہے اور اس طرح اپنے "معنی لفظ آدمیت" ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔ ان کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی صفت انسانیت تھی، خود لکھتے ہیں۔

"اس لئے میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی صفت انسانیت ہے یعنی تمام انسانوں کی عزت کرنا کیونکہ وہ انسان ہیں ان کی فلاح و بہبود میں اپنی بہتری تلاش کرنا، اس بات کا پر خلوص یقین کہ (تقریباً) ہر شخص کے اندر نور الٰہی کی چنگاری پوشیدہ ہے۔ جس کو محنت اور صبر اور محبت سے جگانا سماج کا مشترکہ فرض ہے۔ اکثر عقل کی آنکھ اور مشاہدے کی قوت اس چنگاری کو نہیں دیکھ سکتی۔ کبھی کبھی ماہر نفسیات کی نظر بھی اس تک نہیں پہونچ پاتی۔ لیکن دل اسے محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ محبت کا اسم اعظم اس میں پوشیدہ ہو۔ یہ محبت ہی کی کنجی ان سارے پردوں کو ہٹا سکتی ہے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

جن کے اندر یہ چنگاری چھپی ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ، جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں "نور الٰہی کی چنگاری" کے الفاظ سے بدکیں لیکن وہ بھی یہ مان سکتے ہیں کہ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت ہوتی ہے جس کی مناسب تربیت سے نہ صرف اس کی اپنی شخصیت مالا مال ہو سکتی ہے بلکہ وہ سماج کا ایک مفید کارکن بھی بن سکتا ہے۔" (آندھی میں چراغ ص ۱۹)

ان کے اس عالمگیر تصور انسانیت کی تشکیل میں جہاں ان کا اپنا مطالعہ اثر انداز ہوا ہے۔ وہاں ان کے خاندان کی روایات بھی شامل رہی ہیں۔

سیدین صاحب کا خاندان

سیدین صاحب کے چچا خواجہ غلام الحسنین کی ایک خود نوشت سوانح عمری انجمن وظیفۂ سادات و مومنین" کے سلور جوبلی نمبر میں شائع ہوئی ہے جس کی روشنی میں آپ کے خاندان کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ (سلور جوبلی نمبر ۱۹۳۶ء ص ۱۹۷) ۱۹۰۴ء میں سیدین صاحب پانی پت کے تاریخی قصبے میں پیدا ہوئے انھوں نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ شروع ہی سے نور ایمان سے منور تھا۔ اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ آباد چلی آتی ہے۔ یہ لوگ ایوبی انصاری کہلاتے ہیں یعنی صحابیٔ رسول حضرت ابو ایوب رضؓ انصاری کی اولاد میں سے ہیں، سیدین صاحب اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی جو بلحاظ علم و فضل و زہد و تقویٰ اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے، ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں بعہد سلطان غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے، خواجہ ملک علی شیخ الاسلام

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے تھے خواجہ عبداللہ انصاری کا نام ہندوستان کے اہل علم میں بہت مشہور اور افغانستان و خراسان و ایران میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ "تاریخ ادبیات ایران" (ص ۱۱۳) میں ڈاکٹر رضازادہ شفق رقمطراز ہیں کہ خواجہ عبداللہ انصاری کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری تک پہونچتا ہے۔ آپ نے فارسی نظم میں ایک مخصوص لحن اور مخصوص سبک پیدا کیا۔ اور نہایت فصیح نثر و نظم کے نمونے پیش کئے۔ خواجہ صاحب اپنے زمانے کے زبردست محدثوں اور عارفوں میں شمار ہوتے تھے۔ فطرت سے غیر معمولی حافظہ لے کر آئے تھے۔ اس لئے انھیں سیکڑوں اشعار اور اقوال یاد تھے۔ مشائخ میں خاص کر ابوالحسن خرقانی سے ارادت رکھتے تھے۔ پھر ابوالحسن خرقانی کی وفات کے بعد ان کے جانشین بھی ہوئے۔ عربی میں ذم الکلام اور سائرین اور فارسی میں زاد العارفین اور کتاب الاسرار جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ایک فارسی رسالے بھی تصنیف کئے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) رسالۂ دل و جان	(۲) کنز السالکین
(۳) رسالۂ واردات	(۴) قلندر نامہ
(۵) ہفت حصار	(۶) محبت نامہ
(۷) رسالہ معقولات	(۸) الٰہی نامہ

خواجہ عبداللہ انصاری کی سب سے مشہور تصنیف ان کی مناجات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے زمانے تک کسی نے بھی ایسی سیدھی سادی موثر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اور شیریں فارسی میں مناجات نہیں لکھی تھی۔ ان کی یہ مناجات ان کے مذکورہ رسالوں اور دوسری کتابوں میں ملتی ہے اور پانچویں صدی کی سجع اور دلکش نثر کا بہترین نمونہ ہے اس کے علاوہ خواجہ صاحب کا شمار ایران کے قدیم رباعی گو شعرا میں بھی ہوتا ہے خواجہ صاحب نے اپنی وعظ کی مجلسوں میں مشہور صوفی بزرگ عبدالرحمٰن سلمی کی کتاب طبقات الصوفیہ کا ہروی زبان میں ترجمہ اپنی طرف سے املا کرایا تھا۔ خواجہ صاحب کے مریدوں میں سے ..... ایک مرید نے اسے مرتب کر دیا تھا۔ نویں صدی ہجری میں مولانا عبدالرحمٰن جامی نے ہروی زبان سے اسے سیدھی سلوھی فارسی زبان میں منتقل کیا۔ اسی میں اپنی طرف سے اور مشائخوں اور بزرگوں کے حالات کا اضافہ کیا۔ اور اس کا نام نفحات الانس رکھا۔ خواجہ صاحب نے ۴۸۱ھ میں بمقام ہرات وفات پائی۔ (تاریخ ادبیات ایران از رضازادہ شفق)

چونکہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا۔ کہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا شاہزادہ محمد مسلما شعرا اور دیگر اہل کمال کا عہد سے زیادہ قدرداں تھا۔ اس لئے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان وغیرہ سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ ایسی شہرت نے خواجہ ملک کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتدبہ اراضی سواد قصبہ پانی پت بغرض سکونت عنایت کی۔ اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات بزرگان دین جو سواد پانی پت میں واقع ہیں۔ اور خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی۔ فرمان شاہی میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ یہ اراضی بطور معافی دوامی عطا کی جاتی ہیں یعنی جب تک خواجہ ملک غسلی کی اولاد میں سے ایک شخص

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

بھی باقی رہے اس وقت تک یہ حاتی برقرار رہے خواجہ ملک علی کا سلسلۂ نسب چھبیس ۲۶
واسطوں سے حضرت ابوایوب انصاری تک، اٹھارہ واسطوں سے شیخ الاسلام خواجہ
عبداللہ انصاری تک اور دس
واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان
و عراق عجم کا فرمان روا تھا پہنچتا ہے خواجہ ملک علی کا انتقال ۷۸۵ھ میں ہوا۔ خاندان
ابوایوب انصاری کے بعض لوگ ایران میں آکر آباد ہوئے۔ شاہ ابواسحٰق انجو ممدوح
خواجہ حافظ شیرازی جو فارس کا ایک سخی و عادل بادشاہ تھا۔ اسی خاندان سے تعلق
رکھتا تھا۔ اسی بادشاہ کی مدح میں خواجہ حافظ نے لکھا ہے۔

جمال چہرۂ اسلام شیخ بواسحٰق
کہ ملک از قدمش زیب بوستاں گیرد

اور دوسری جگہ یوں لکھا ہے۔

بروز کاف والف از جمادی الاوّل — بسال ذال و دگرنون و حا علی الاطلاق
خدائیگانِ سلاطین مشرق و مغرب — خدیو کشور لطف و کرم باستحقاق
سپہر علم و حیا آفتاب جاہ و جلال — جمال دنیا و دیں شاہ شیخ ابواسحٰق
گذاشت عرصۂ میدان خود بہ تیغ عدم — نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

پہلے شعر سے تاریخ وفات نکلتا ہے۔ یعنی ۲۱ جمادی الاوّل ۷۵۸ھ شاہ
ابواسحاق کی سلطنت صرف چودہ برس قائم رہی اور اس کے بعد ہی ختم ہو گئی جس کی
طرف خواجہ حافظ نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

راستی خاتم فیروزۂ بواسحاقی — خوش درخشید ولی دولت مستعجل بود

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیدین صاحب کے چچا خواجہ غلام الحسنین فلسفہ تعلیم کے بڑے ماہر اور فن تعلیم کے استاد تھے سیدین صاحب کے نانا خواجہ الطاف حسین حالی نے سرسید احمد خاں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تعلیمی، معاشرتی، مذہبی اور ذہنی اصلاح میں معتدبہ حصہ لیا۔ اور مسدس حالی لکھ کر اپنا نام زندۂ جاوید کر گئے۔ سیدین صاحب کے والد ماجد خواجہ غلام الثقلین مرحوم غازی گڑھ کے ان مایۂ ناز فرزندوں میں سے تھے جن کا نام آج بھی مسلم یونیورسٹی میں فخر سے لیا جاتا ہے۔ وہ نہایت فصیح البیان مقرر اور بلند پایہ مصنف تھے انھوں نے ایک نامور قومی لیڈر اور یوپی کونسل کے ممبر ہونے کی حیثیت سے بہت سی گرانقدر خدمات انجام دیں اور رسالہ "عصر جدید" اور "تحریک اصلاحِ تمدن" کے ذریعہ سے ملک کی اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے ۳۵ برس کی عمر میں اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا۔

ان کی "حق گوئی و بیباکی" شروع ہی سے مشہور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے سامنے ایک ریزولیشن رکھا تھا کہ شیعہ حضرات اپنی مجلسوں اور تصنیفوں میں حضرات صحابہ پر سب و شتم بنام تبرا نہ فرمائیں۔ کیونکہ اس سے حضرات اہل سنت کی دلآزاری ہوتی ہے۔ اور ملت اسلامیہ میں تفریق پیدا ہوتی ہے، مولانا ناصر الملت نے ان کی سخت مخالفت کی۔ آخر کار انھوں نے شیعہ کانفرنس سے استعفیٰ دیدیا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا سلسلۂ نسب سے ظاہر ہے کہ اس خاندان میں شروع سے تصوف کی کارفرمائی تھی اور یہ تصوف ہی کسی زمانے میں منجر بہ تشیع ہوا تھا۔ لہذا اس خاندان میں "تولا" کی تو گنجائش تھی لیکن "تبرا" کی نہیں۔ علاوہ ازیں سرسید کے اثرات سے بھی اس خاندان میں کافی ذہنی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ لہذا یہ حضرات فروعی اور جزوی باتوں کو کبھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بلکہ جو لوگ اہمیت دیتے تھے۔ ان کی سختی سے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

مخالفت کرتے تھے۔ چنانچہ شیعوں کے ایک رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ غلام الثقلین نے لطیف طنز کے انداز میں لکھا تھا:

"حضرت لقمان کی حکایات میں لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو دو تھیلیاں دی تھیں۔ ایک اپنے عیبوں کی جو آگے کی طرف تھی۔ دوسری اوروں کے عیبوں کی جو پشت پر تھی۔ مگر حضرت انسان نے اس کو پلٹ کر دوسروں کے عیبوں کی تھیلی کو آگے کر لیا۔ اور اپنے عیبوں کی تھیلی پیچھے ڈال لی۔ یہی حالت اس رسالے کی ہے۔ بے شک یہ اصلاح چاہتا ہے۔ لیکن فرقہ اثنا عشری کی نہیں، دوسرے فرقوں کی جن میں سے لاکھ میں سے ایک بھی شاید اس رسالے کو نہ پڑھتے ہوں گے! وہی پرانے اعتراض جو شیعہ سنیوں پر کیا کرتے تھے۔ ان کو چکا کر نئی زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ یا سنیوں کے اعتراضوں کا جواب ہوتا ہے..... جب کہ شیعہ روز بروز مفلس، دریوزہ گر اور تباہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اپنی ناعاقبت اندیشی اور اسراف اور غرور کی وجہ سے جائیدادیں اور ریاستیں کھو رہے ہیں۔ اور کھوتے جاتے ہیں تو بجائے مشہور کہن اور مسیح کے مسائل پر اتنا غور اور مباحثہ کرنا کب جائز ہے؟..... اس فرقہ کے سرگروہ نہ اپنے زوال کو سمجھتے ہیں نہ اس کی وجوہ پر غور کرتے ہیں۔ نہ اپنے عادات و خصائل کو دنیا کی رفتار کے مطابق اور پسندیدہ بناتے ہیں مگر یہ کلام میں جو کرنے چاہئیں ورنہ یہ کہنا کہ میں بہت گورا ہوں اور میرے کپڑے بہت اچھے ہیں۔ اور سامنے جو شخص بیٹھا ہے وہ کالا اور بھونڈا ہے اور برے کپڑے پہنتا ہے کس کو نہیں آتا۔ اور ایسی باتوں سے لوگوں کو خوش کرنا کیا مشکل ہے۔" (آندھی میں چراغ ص ۱۸۹)

خواجہ غلام الثقلین کی راست بازی، راست گفتاری اور بے باکی صرف مذہبی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

امور تک محدود نہ تھی۔ بلکہ وہ ہر معاملے میں اسی طرح اظہار خیال کرتے تھے۔ چنانچہ بابائے اردو مولوی عبدالحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"وہ (غلام الثقلین) اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کے کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اور اس لئے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے۔ مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔ خود سرسید مرحوم انھیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے مگر اختلاف رائے میں وہ ان سے بھی نہ چوکتے تھے۔ حالانکہ ان کے سامنے بڑوں بڑوں کے پر جلتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات اتنی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا اتھک ہو۔ وہ پرلے درجے کے ذہین اور ذکی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے اور پالیٹکس اور خصوصاً انگلستان کی سیاسیات سے انھیں ابتدا سے بے انتہا دلچسپی تھی اور جس قدر انھیں اس سے واقفیت تھی۔ ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو۔ وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔ (چند معاصر از مولوی عبدالحق)

اس خصوصیت میں سید ین صاحب اپنے والد مرحوم کا جواب تھے اور الولد سرٌ لابیہ کا صحیح مصداق انھوں نے ہمیشہ اپنی تقریروں سے، تحریروں سے۔ منصبی کاموں سے، ہر قسم کی آزمائش کے باوجود نہایت جرأت و بیباکی کے ساتھ ان اعلیٰ قدروں کی خدمت اور اشاعت کی ہے جو ہماری قومی زندگی کی تشکیل میں نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں فکر و عمل کا ایک ایسا مکمل اور مرتب اور مربوط نظام پیش کیا ہے۔ جس میں مغربی حریت اور مشرقی للّٰہیت عزمی سادگی اور عجمی تہذیب تاریخ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

فہمی اور فلسفیانہ غور و فکر نے ایک منفرد شان پیدا کر دی ہے۔

سیدین صاحب کو یہ علم و حکمت، عقل و تدبر اور زبان و ادب کے یہ جوہر وراثت میں ملے تھے اور انھوں نے اپنی دل آسا شخصیت میں ان تمام قدروں کو سمویا تھا۔ جو ہماری تہذیبی زندگی میں ایک اساس اور ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سیدین صاحب کی ابتدائی تعلیم

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

سیدین صاحب کو گیارہ برس کی عمر تک خواجہ غلام الثقلین کی تربیت اور نو برس کی عمر تک خود حالی کی ہدایت نصیب ہوئی۔ آپ نے میٹرک تک حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں تعلیم پائی۔ آپ کے اساتذہ اس چھوٹی سی عمر میں آپ کی بے نظیر لیاقت اور فصیح البیانی دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے۔ اور انھیں بہ نسبت عمر کے آگے بڑھا ہوا پاتے تھے اسکول کی ہر تحریک ہر سوسائٹی اور ہر انجمن میں آپ نے نہ صرف حصہ ہی لیا۔ بلکہ اپنے ہمعصروں کو اپنی غیر معمولی خداداد لیاقت کا پورا پورا ثبوت دیا۔ زبان کی روانی اور فصیح البیانی جس نے آپ کے نام کو نہ صرف ہندوستان بلکہ آگے چل کر یورپ تک مشہور کر دیا تھا بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ ذہانت و ذکاوت کا ظہور بھی عہد طفلی ہی سے ہونے لگا تھا۔ اسکول میں کسی مباحثہ یا علمی انجمن میں جب کبھی آپ حصہ لیتے تو طلبہ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں عاجز پاتے۔ اسکول کے کسی کام میں اساتذہ کو ان کے متعلق شکایت کا موقع نہیں ملا آپ نے ہر کام میں باقاعدگی کو ملحوظ خاطر رکھا۔ کھیل ہو یا تعلیمی کام اس میں کما حقہ حصہ لیا۔ اسکول کی لائبریری میں جو پڑھنے کے قابل کتابیں تھیں وہ سب انھوں نے پڑھیں آپ کے والد صاحب نے کچھ اچھی کتابیں پڑھنے کے لئے مہیا کیں جن سے اس

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہونہار نوجوان نے پورا استفادہ کیا۔ آپ ہمیشہ نظم وضبط اور اسکول کی بالا ہستیوں کے استادوں کی عزت اور ساتھیوں سے محبت آپ کا شعار تھا۔ یہ اوصاف تھے۔ جو فطرت نے ان کو ودیعت کئے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین نے ایک کتاب طالب علم کی زندگی لکھی تھی۔ جس کے حرف حرف کو سیدین نے عملی جامہ پہنایا۔ ان کی زندگی اس کتاب کی زندہ تصویر نظر آنے لگی۔ ہندوستان کے لئے ہائی اسکولوں نے ان سے بہتر شاید ہی کوئی طالب علم دیکھا ہو۔ اور اگر کوئی اسکول ایسا طالب علم پیدا کردے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے اپنا تعلیمی فرض پورا کر دیا۔

سیدین صاحب نے ۱۹۱۹ء میں جب ان کی عمر پندرہ سال تھی حالی مسلم اسکول پانی پت سے اعزاز وامتیاز کے ساتھ میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔

علی گڑھ میں داخلہ

میٹریکولیشن کا امتحان پاس کرتے ہی آپ نے علی گڑھ میں داخلہ لیا اور یہاں سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات فرسٹ ڈویژن اور یونیورسٹی بھر میں اول رہ کر پاس کئے۔ قیام علی گڑھ کے دوران آپ نے یونیورسٹی میں تقریر کے جس قدر انعامات تھے حاصل کئے۔ بنارس میں آل انڈیا ڈبیٹ ہوئی۔ آپ بھی اس میں شریک ہوئے۔ کامیابی کے تاج کے لئے بہتیروں نے سخت کوششیں کیں۔ لیکن یہ تاج آپ ہی کے فرق مبارک کی زینت ہوا۔ یونیورسٹی میں ایک کیمبرج میڈل ہر سال ایک طالب علم کو عطا ہوا کرتا تھا۔ آپ کے والد صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں وہ میڈل حاصل کیا تھا۔ لیکن جب آپ کا یونی ورسٹی کا زمانہ آیا تو آپ نے بھی وہی میڈل حاصل کیا۔ آپ نے یونین میں اپنی خوبی تقریر کے ساتھ یونی ورسٹی میگزین میں اپنی ندرت تحریر کا بھی سکہ بٹھایا۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تعلیم انگلستان

۱۹۲۳ء میں آپ فرسٹ ڈویژن اور پوزیشن سے بی اے پاس کر کے حکومت ہند کے وظیفہ سے لیڈز یونیورسٹی میں جو ان دنوں انگلستان میں فن تعلیم کا بہترین ادارہ سمجھی جاتی تھی داخل ہوئے وہاں آپ نے "ڈپلوما ان ایجوکیشن" کا امتحان پاس کیا جس میں دوہرا امتیاز حاصل کیا جو یونیورسٹی کی تاریخ میں آپ سے پہلے صرف ایک مرتبہ ایک طالب علم کو حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں آپ نے ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی جس کے لئے "مغرب میں تعلیم جدید کے رجحانات" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا۔ جو ممتحنوں نے بہت پسند کیا۔ لیڈز یونیورسٹی کے قیام کے دوران آپ کو یونیورسٹی کا نمائندہ بنا کر دوسری یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا یونیورسٹی یونین پارلیمنٹ کے وزیر اعظم اور انٹرنیشنل سوسائٹی کے صدر کے فرائض آپ نے انجام دیئے۔ متعدد اہم مباحثوں اور علمی انجمنوں میں حصہ لیا۔ آپ کی تقریریں اور بحثیں دو سال تک انگلستان بلکہ دنیا کے سب سے مشہور اخبار ٹائمز میں شائع ہوتی رہیں۔

ملازمت

انگلستان سے واپس آتے ہی علی گڑھ کی مشہور جوبلی ڈبیٹ میں بحیثیت محرک حصہ لیا۔ اور باوجود سر علی امام اور سر جناح وغیرہ کی مخالفت کے مضمون زیر بحث کو یونین نے پاس کیا۔

سیدین صاحب ایکس برس کی عمر میں مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں ریڈر کی حیثیت سے اصول تعلیم اور طریق تعلیم کا درس دینے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں سیدین صاحب کی شادی رامپور کے نواب زادہ ساجد علی خاں کی ہمشیرہ عزیز جہاں بیگم سے ہوئی اور اسی سال وہ ایجوکیشن کے پروفیسر اور ٹریننگ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آٹھ برس کی مدت میں اس کالج نے ان کی رہنمائی میں غیر معمولی ترقی کی اور ملک میں ایک امتیازی شان حاصل

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کرلی۔ یہ ارادہ ملک کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار ہونے لگا۔ اس کی ڈگریوں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ طلبہ کو سرکاری وظائف اور سرکاری ملازمتیں ملنے لگیں آپ کی اس کارکردگی کی وجہ سے یونیورسٹی کے باہر ہندوستان کا تمام تر علم دوست طبقہ آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ تمام یونیورسٹیاں آپ کو ایک غیر معمولی شخصیت تسلیم کرنے لگیں۔ ملک کی تمام ادبی اور تعلیمی انجمنیں اپنے سالانہ اجلاس میں آپ کی صدارت کو اپنے سعادت سمجھنے لگیں اسی دور کے ٹریننگ کالج کے طلبہ کا بیان ہے کہ سیدین صاحب اپنی علمی قابلیت کے علاوہ حسن اخلاق، انکسار طبع اور فرض شناسی میں بہت مشہور تھے۔ زیادہ بلند آواز سے بولنا۔ خودستائی یا مبالغہ کرنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ تعلیمی انہماک کا یہ عالم کہ صبح سے شام تک لیکچر تیار کرنے، طلبائے ٹریننگ کالج کے اسباق کی نگرانی اور ان کے مضامین کی تصحیح کرنے سے بالکل فرصت نہیں ملتی تھی۔ وقت کے اس قدر پابند تھے کہ ہر کام کے لئے پانچ سات منٹ پہلے پہونچ جاتے تھے۔ طلبہ ہمیشہ آپ کے پیریڈ کے منتظر رہتے تھے۔ جب کلاس میں آپ تقریر کرتے تو طلبہ ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے طریقہ تعلیم ایسا دلکش اور اسلوب بیان ایسا سادہ ہوتا تھا کہ بے اختیار طالب علم کی زبان سے نکلتا تھا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وردھا اسکیم میں سیدین صاحب کا حصہ

اسی زمانے میں مہاتما گاندھی نے تعلیم بالعمل کا تصور ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس تصور کو نظری اور عملی حیثیت سے مکمل کرنے کے لئے گاندھی جی نے ذاکر صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی اور اس کے اراکین میں ماہر تعلیم کی حیثیت سے سیدین صاحب کو بھی رکھا۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیدین صاحب نے اس رکنیت کو بہ طیب خاطر منظور کیا۔ کیونکہ اولاً تو یہ کہ سیدین صاحب کو گاندھی جی سے فکر و عمل کی بلندیوں کی وجہ سے گہری عقیدت اور شیفتگی تھی۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" کے حصہ دیم۔ صحبت اہل صفا میں گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال کی زبان میں گاندھی جی کو مرد مومن قرار دیا ہے لکھتے ہیں۔

"مہاتما گاندھی! معقول اور نیک لوگ جن کی اپنی ہمت جواب دے چکی تھی۔ بس اسی ایک مرد مومن کی اخلاقی جرأت اور قیادت پر آسرا لگائے ہوئے تھے۔ (آندھی میں چراغ ۹۰)

ایک جگہ لکھا ہے:-

"جب کبھی میں یہ شعر (اقبال کا) پڑھتا ہوں ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

تو گاندھی جی کی زندگی نظروں کے سامنے پھر باقی ہے۔" (آندھی میں چراغ ص ۱۳۷)

ثانیاً یہ کہ اس اسکیم کے ذریعہ ہندوستان کی تعلیمی زندگی میں نئی روح پھونکنا تھی۔

سیدین صاحب نے بنیادی تعلیم کی اسکیم کا تعارف جسے وردھا اسکیم بھی کہا جاتا ہے۔ (کیونکہ اس کی بنیاد وردھا کی تعلیمی کانفرنس میں پڑی تھی) اسطرح کرایا ہے۔

"اس ضمن میں اس عظیم الشان کارنامے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے میدان میں انجام دیا۔ اس طریقہ تعلیم کا خیال اپنی ابتدائی شکل میں مہاتما گاندھی کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ یاست اور ریاست اصلاح کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں اور زندگی کے عملی تقاضوں کے ساتھ کا صحیح، مناسب رشتہ قائم نہ کیا جائے۔ گذشتہ دو سو برس سے یہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اور تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھندوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کام جو اس میں جان ڈالتا ہے، جو شخصیت کی تربیت کرتا ہے اسکول کی چار دیواری کے اندر مار نہ پا سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے قوم کے سامنے ایک تعلیم کا ایسا تصور پیش کیا جو علم اور عمل میں ہاتھ کے کام اور کتابی تعلیم میں، جسم اور دماغ میں، فرد اور سماج میں اور سماج کے مختلف طبقوں میں جو تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ دور کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کر دے۔ جب ان کی بلائی ہوئی کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی تو اس کے ایک ممبر ذاکر صاحب بھی تھے۔ ان کی ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد قابلیت اور خلوص اور خوبی تقریر سے ہر کمیٹی اور کانفرنس پر چھا جاتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی وہی حادثہ پیش آیا۔ کانفرنس بہ حیثیت مجموعی ان کے خیالات سے کافی متاثر ہوئی اور اس لئے گاندھی جی کی نظر انتخاب نے ذاکر صاحب کو اس کمیٹی کی صدارت کے لئے چنا جو اسکیم کو مرتب کرنے کے لئے بنائی گئی۔" (آندھی میں چراغ ص ۲۸۸)

وردھا اسکیم کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے سیدین صاحب نے کہیں بھی اپنا نام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ اہل نظر جانتے ہیں کہ اس اسکیم کے بنانے میں بہت بڑا حصہ سیدین صاحب کا تھا۔ دراصل ان کی طبیعت میں عجز و انکسار اتنا تھا کہ وہ اپنے کمالات اور کارناموں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان باتوں کی طرف کبھی بھولے سے بھی اشارہ نہیں کرتے تھے۔ اس اسکیم کے بنانے میں ذاکر صاحب کی حیثیت اگر معلم اول افلاطون کی سی ہے تو سیدین صاحب کی حیثیت معلم ثانی ارسطو کی سی ہے۔ تعلیم کو تہذیب و تمدن اور معاشرت و معیشت کی اعلیٰ قدروں کے پس منظر اور پیش منظر میں دیکھنے کے جو اصول ذاکر صاحب نے بتلائے تھے۔ انھیں سیدین صاحب نے اپنے فکر و نظر سے نیا رنگ و آہنگ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

عطا کیا جیسے ہی وردھا اسکیم کے نصاب تعلیم کا پتہ گورو بالا سوامی آنند گر کو چلا جو اس وقت ریاست جموں و کشمیر میں وزیر اعظم تھے تو انھوں نے بھی وہاں بنیادی تعلیم کو جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اور ذاکر حسین صاحب کو اس سلسلے میں رہنمائی کی دعوت دی ذاکر صاحب اس وقت جامعہ ملیہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی جگہ سیدین صاحب کو بھیج دیا۔ سیدین صاحب نے وہاں تعلیم کی اصلاح و ترقی میں سات برس (۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء) تک وہ گرانقدر کارنامے انجام دیئے جو بھلائے نہیں جا سکتے۔

سیدین صاحب کے مختلف مناصب اور خدمات

آئندہ سولہ برس میں سیدین صاحب نے دو برس ریاست رامپور کے اور تین برس ریاست بمبئی کے مشیر تعلیم کی خدمات انجام دیں۔ پورے گیارہ برس ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک حکومت ہند کی وزارت تعلیمات میں پہلے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ سرکاری ملازمت میں سبکدوشی کی عمر پر پہنچ جانے کے بعد کشمیر، ریاست ہائے متحدہ کی دس کانسن اور ہوائی یونیورسٹیوں میں مہمان پروفیسر، حکومت ہند کے محکمہ تعلیمی منصوبہ بندی اور نظم و نسق کی تعلیم دینے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اسی دوران میں کئی بار اپنی حکومت، دوسرے ملکوں کی حکومتوں بین الاقوامی تعلیمی اور علمی اداروں کے نمائندے دنیا کے کئی درجن ملکوں میں جانے اور رہنے کا موقع ملا۔ ان سفروں میں سے تین سفر نہایت اہم ہیں پہلا سفر وہ جو حکومت عراق اور دوسرا سفر وہ جو حکومت سوڈان کی دعوت پر ان ملکوں کی تعلیمی تنظیم کی رہنمائی کے لئے اختیار کیا گیا۔ تیسرا سفر وہ جس میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے ان کو دنیا کے سات اور نامور ماہرین تعلیم کو بلا کر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

امتیازی نشان خدمت سے سرفراز کیا۔ قبل ازیں انھیں خود اپنے ملک میں دو بڑے اعزاز مل چکے تھے ایک تو ساہتیہ اکیڈمی کا اردو کی بہترین ادبی تصنیف کا انعام جو ان کی کتاب آندھی میں چراغ پر ملا تھا۔ دوسرا پدم بھوشن کا تمغہ جو کسی شعبہ زندگی میں نمایاں خدمت انجام دینے پر دیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں گو سیدین صاحب گوشہ نشین ہو گئے مگر اس کے باوجود بھی انھوں نے علمی رہنمائی کے لئے بیرونی ملکوں اور اپنے ملک کے کئی حصوں کے متعدد سفر کئے۔ آخری زمانے میں انھوں نے دو کتابیں بھی لکھیں۔ ایک اردو میں ہے۔ جس میں اپنی عمر کے ابتدائی چالیس سال کے حالات اور مشاہدات کا ذکر ہے۔ اور دوسری انگریزی میں اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے لئے جو اسلام اور اسلامیات کے عمر بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ہے یہ تمام تر اطلاعات قبلہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے تعزیتی مضمون پر منحصر ہیں۔ جو "اسلام اور عصر جدید" جنوری ۱۹۷۸ء میں شامل ہے۔ غرض کہ مرحوم کی زندگی تادم مرگ جہد و عمل کی زندگی تھی اور اس شعر کا صحیح مصداق ہے

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست ما زندہ از انیم کہ آرام نگیریم

(۱) سیدین صاحب اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دیگر مذہبی، علمی اور ادبی انجمنیں

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را وقت است دگر تبلکہ سازند حرم را

سیدین صاحب زندگی بھر اپنی وسیع القلبی اور فراخدلی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

طرح کی علمی، ادبی اور مذہبی انجمنوں کو زینت بخشتے رہے۔ انجمن وظیفۂ سادات کے وہ اہم رکن رہے، آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور اسی طرح دوسری ادبی انجمنوں کو بھی فروغ بخشتے رہے۔ وہ ہر جگہ اپنے بنیادی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے۔ مسلم یونیورسٹی سے تو گویا ان کو عشق تھا۔ وہ یہاں کے طلبہ کے لئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنے میں پیش پیش رہتے تھے، یہاں تک کہ فارغ التحصیل طلبہ جب ان سے ملتے تو ان کے لئے ملازمتوں کے واسطے بھی بیحد کوششیں کرتے تھے۔ وہ اپنے عہد کے طلبہ سے ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد تک سے اسی قسم کا سلوک کرتے تھے۔

ایک صاحب حامد رضا ان کی پرنسپل شپ کے زمانے میں یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ حامد رضا صاحب کو سیدین صاحب کی صحبت و خدمت میں رہ کر پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوا اور انھوں نے اسلامیات اور ہندوستانی تہذیب پر انگریزی میں کتابیں بھی لکھیں ہیں۔ سیدین صاحب حامد رضا صاحب کے لئے ہمیشہ ترقی کے کوشاں رہے۔ حامد رضا صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے عدنان رضا کو بھی انھوں نے اسی شفقت و محبت کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ جب عدنان رضا نے ایم اے (انگریزی) آنرس پاس کر لیا تو ان کو دہلی بلا کر لکچرر شپ دلادی اور یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی ان کے واسطے سفارشی خطوط لکھے آج عدنان رضا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ انگریزی میں لکچرار ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

1490

مسلم یونیورسٹی کے طلبہ جب بھی ان سے ملتے تو وہ انھیں اعلیٰ قدروں کی تلقین کرتے اور علوم وفنون کے میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے۔ یوں تو وہ ملک کے سبھی نوجوانوں کو بالعموم اچھی اور اعلیٰ قدروں کا گرویدہ بناتے لیکن مسلم یونیورسٹی کے نوجوانوں سے بالخصوص انھیں یہ امیدیں زیادہ وابستہ رہیں۔ مالک رام نے ان کے متعلق ٹھیک کہا ہے

"ان کا موضوعِ سخن تعلیم تھا وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعہ اپنے عہد کے نوجوانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کرتا دھرتا بننے والے تھے، سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا مستحق کون ہے اور کسی شخص کو اس لفظ کا اچھا مصداق بننے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ سیدین صاحب کا مطمح نظر بھی ساری عمر یہی رہا۔ (تذکرۂ معاصر)

ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کی مسلم یونیورسٹی کے معاملات سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء کے ناگوار حادثات سے انھیں بہت تکلیف پہونچی تھی۔ اور اس سے جو نتائج نکلے وہ ان کے لئے اور زیادہ ملال انگیز تھے۔ میں نے اس زمانے میں ایک تفصیلی مضمون یونیورسٹی سے متعلق لکھا تھا۔ جو اخبار "ترجمان" ہفت روزہ علی گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں میں نے یونیورسٹی پر مختلف حلقوں کی جانب سے کئے گئے اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ سیدین صاحب نے یہ مضمون

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پڑھ کر مجھے خط لکھا۔ جس میں یونیورسٹی سے متعلق یہ الفاظ درج تھے۔

"علی گڑھ یونیورسٹی پر آجکل مختلف اطراف سے نکتہ چینی ہو رہی ہے جس میں غلط اور صحیح دونوں قسم کی تنقید شامل ہے آپ نے جو کوشش اپنے نقطۂ نظر سے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے کی ہے اس سے امید ہے کہ کچھ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔"

مسٹر فخرالدین علی احمد وزیر کابینہ نے جو بیگ کمیٹی قائم کی تھی۔ سیّدین صاحب اس کے بھی ایک سرگرم رکن تھے۔ اور انھوں نے یونیورسٹی کے بارے میں نہایت مخلصانہ اور قوم پروانہ مشورے دیتے تھے۔ وہ اس یونیورسٹی کو ایک قومی ادارہ سمجھنے کے باوجود اس کی اسلامی اور تاریخی خصوصیات پر بہت زور دیتے تھے۔ اُن کے انتقال سے "بیگ کمیٹی" بے دست و پا ہو کر رہ گئی ع

آں قدح بہ شکست و آں ساقی نماند

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو صرف علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی دلچسپی تھی بلکہ بقول مالک رام صاحب ان کو ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں اسی طرح عزیز تھیں۔ اور ان کو ان کے تعلیمی معاملات سے اسی طرح دلچسپی تھی۔ جیسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انھوں نے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں جو رول ادا کیا ہے۔ اسے اب تک پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس موضوع پر جب کسی کو سمجھنے اور لکھنے کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کی توفیق ہوگی تو پتا چلے گا کہ انھوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

ہر کس نشناسندۂ راز است وگرنہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است (عرفی)

مالک رام صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کے بیشتر یونیورسٹیز [illegible] پالیسی کی تشکیل میں سیدین صاحب کا ہاتھ رہا ہے انھوں پس پردہ رہ کر خاموشی سے اس میدان میں جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ (تذکرۂ معاصر)

البتہ علی گڑھ یونیورسٹی سے انھیں اس لئے عشق تھا کہ وہ ان کی مادر علمی ہے۔ اور اسی لئے وہ اس کی حمایت اور پاس داری میں جائز حد تک ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء تک جو یونیورسٹی پر مسلم لیگی اثرات رہے تھے۔ ان سے بھی واقف تھے۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد اس کو قومی دھارا میں بہانے کی جو کوششیں کی جارہی تھیں ان سے بھی باخبر تھے وہ اس ادارے سے مایوس نہ تھے اور ان کے پیش نظر عرفی شیرازی کا یہ قول تھا۔

کسی کہ محرم باد صباست می داند
کہ باوجود خزاں بوے یاسمن باقیست

انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی ہمدردی اور حمایت میں جائز حد

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تک حصہ لیا لیکن انھوں نے بعض علمی گی پسند اور تاریک خیال مسلم جماعتوں کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ جو یونیورسٹی کی نادان دوست ہیں مادر علمی سے عشق کی راہ کو انھوں نے مجنوں و فرہاد کی طرح نہیں بلکہ اپنی ایک انفرادی شان سے طے کیا ؎

راہ مجنونی و فرہادیم آمد در پیش
رفتم ایں راہ و لیکن نہ چو ایشاں رفتم

لیکن اس کو کیا کیجئے کہ بعض فرقہ پرست ارباب سیاست اور متعصب ارباب اقتدار کو یہ جائز حمایت بھی گوارا نہ ہوئی اور سیدین صاحب پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے۔

بہ جرم عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

لیکن جونہی سیدین صاحب کے ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے مخالفوں کے سارے الزامات تار عنکبوت ثابت ہوئے اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا اس شورش کدۂ مستی میں افسردگی و خمار آلودگی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا۔

بہ بدمستی سزد گر تہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادہ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد

اتنا ہی نہیں بلکہ کہنا چاہئے شورش تازہ کی سرمستیاں، مجلس دوشیں کی کیفیتوں سے بھی کہیں تند تر ہو گئیں ؎

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

چہ مستی است ندانم کہ روبہ ما آورد
کے بود ساقی وایں بادہ از کجا آورد

سیدین صاحب کھل کر میدان میں آئے اور مخالفوں کو ایسی شکست دی کہ وہ عمر بھر یاد رکھیں گے انھوں نے اپنی جرأت و ہمت سے فارسی شاعر کے اس قول کی تصدیق کر دی۔

تا دستہ بہم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

اس داستان کشمکش کو ڈاکٹر عابد حسین نے نہایت دلچسپ اور مجمل انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"صبر، ضبط اور حلم میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اس راہ میں جو انھوں نے اپنے لئے منتخب کی تھی، انھیں سخت مشکلیں پیش آئیں۔ اکثر حریفوں کی دراندازیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فرقہ پرست ارباب سیاست اور متعصب اقتدار کی سازش سے ان پر مسلمانوں اور مسلم اداروں خصوصاً مسلم یونیورسٹی کی بے جا پاس داری کے الزام لگائے گئے اور طرح طرح کی تہمتیں تراشی گئیں۔ ایک مدت تک وہ اس نیش زنی کو خاموشی سے سہارتے رہے۔ لیکن جب پانی سر سے گذر گیا تو وہ جرأت و ہمت کے ساتھ حریفوں کے مقابلے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شدید اور طویل کشمکش کے بعد انھیں ایسی شکست دی کہ وہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ لیکن اس ساری مدت میں کبھی انھوں نے غیظ و غضب

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

یا جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے مخالفوں کے لئے کوئی سخت لفظ ان کی زبان پر یا ان لوگوں کو ذاتی نقصان پہنچانے کا خیال ان کے دل میں نہیں آیا۔ جب دشمنوں کے ساتھ ان کا یہ طرز عمل تھا تو دوستوں، عزیزوں بلکہ سبھی لوگوں سے جن سے ان کا سابقہ تھا۔ جس طرح پیش آتے ہوں گے۔ اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ بڑے سے بڑے قصور پر جس سے انھیں سخت سخت اذیت پہنچی ہو۔ اس نرمی سے مسکراتے ہوئے کوئی مزے دار فقرہ کہہ کر کوئی پر لطف پھبتی کس کر تنبیہ کرتے تھے کہ قصور دار کا ضمیر چونک اٹھے مگر دل نہ دکھنے پائے۔

(اداریہ۔ اسلام اور عصر جدید ص ۱۱ جنوری ۱۹۷۲ء)

(۲) سیدین صاحب کی بے نیازی۔

ان کا نمایاں ترین وصف قناعت پسندی اور بے نیازی تھا۔ غالب کی زبان میں وہ "علم زجاہ بے نیاز" کا مصداق تھے۔

جاہ ز علم بے خبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

انھوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح جاہ و منصب اور سطوت و شوکت کی خواہش نہ کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو ان کے قدرداں تھے لیکن اس کے باوجود بھی کبھی انھوں نے کرسی وزارت یا مسند گورنری حاصل کرنے کی تمنا نہ کی۔ حالانکہ ان کے ساتھیوں اور ماتحتوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ کر وزارت اور گورنری کے عہدے حاصل کئے۔ سیدین

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

صاحب کے دوستوں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اس طرف توجہ کریں مگر انھوں نے اس قسم کے معاملات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو اس کام میں صرف کرے جس کے ذریعے وہ خاص طور پر اپنے فن کی اور عام طور پر علم و تہذیب کی اور انسانیت کی بہترین خدمت انجام دے سکے انھوں نے اپنی زندگی کو اپنے گفتار و کردار کو ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے ہمعصروں کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا۔ وہ اقبال کے نظریہ فقر کے علمی و عملی ترجمان تھے۔ خود انھوں نے اقبال کی جملہ خوبیوں میں سے اس خوبی کو زیادہ سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اقبال میں بہت غیر معمولی خوبیاں تھیں لیکن میرے دل میں بڑی عقیدت ہے اس شان فقر کے لئے جس کی تفسیر انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کی تھی لیکن اس کا خطاب دراصل عصر حاضر کے تمام نوجوانوں سے ہے۔

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈھ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
حاصل اس کا شکوہ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
یہ فقر غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبال نے اس فقیری کو اللہ سے مانگا تھا اور اس کی بدولت وہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ایمان کی دولت سے مالا مال تھے۔ (آندھی میں پرچراغ ص ۱۳۳)

سیدین صاحب اقبال کے اس پہلو سے بہت زیادہ متاثر تھے چنانچہ انھوں نے اقبال سے ذاتی تعلقات کی بنا پر اس طرح کے دو واقعات بھی لکھے ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ اقبال کے ناقدوں میں بحث و نظر کا موضوع رہا ہے اس لئے ان دو واقعات کا ذکر سیدین صاحب کے قلم سے اس موقع پر بے محل نہ ہوگا۔ آخری عمر میں ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اونچی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہونچا دیا تھا۔ جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو

اس شان فقر کے ایک دو دلچسپ واقعات قابل ذکر ہیں سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی اور علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکر معاش سے آزادی حاصل ہو جائے ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال اور ایک دوسرے دولت مند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بہ مشکل بھوپال کی کمتر رقم کو اس سے دو چند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہوئے اور وجہ یہ بیان کی کہ اول تو اتنی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

رقم میری ضروریات کے لئے کافی ہے۔ میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو اس کی امداد قبول نہیں کر سکتا۔ یہ تھا غیرت فقر کا تقاضا، ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے مشاہیر۔ منصب وجاہ و دولت کی خاطر ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار رہیں، اسی قسم کا ایک اور واقعہ انھیں سر اکبری حیدری کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابل ذکر ہے۔ انھوں نے یوم اقبال پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے ایک ہزار روپے کی خطیر رقم بطور تواضع کے پیش کی۔ جب وہ چک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہونچا تو اس نے اسے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا جو بعد میں ارمغان حجاز میں شائع ہوئے۔

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ اے اورنگ شہنشاہی کے — حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات!
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا ہرگز — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات!
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہی میری خدائی کی زکات

(آندھی میں چراغ ص ۱۳۳)

(۳) حسین صاحب اور سیاست سیدین صاحب نے کبھی ارباب سیاست کی درباداری پسند نہ کی وہ تعلیم کو سیاست کے جھمیلوں سے الگ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مالک رام صاحب نے ایک واقعہ درج کیا ہے۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

"۱۹۶۱ء میں ایجوکیشن سکریٹری کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی تو حکومت کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے ہاں بلایا۔ لیکن اب ماحول دوسرا تھا۔ حکومت کے کل پرزے انھیں اپنے مصالح کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سیدین صاحب کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ سال بھر سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۲ء کے شروع میں مستعفی ہو گئے۔" (تذکرہ معاصر)

اسی ضمن میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:۔

"انھوں نے مذہب، علم اور ادب میں سچائی کو پایا اور اپنایا۔ مگر ستم یہ ہے کہ وہ سیاست میں بھی حق و انصاف کو ڈھونڈھتے تھے جس سے انھیں بڑی مایوسیاں ہوئیں اور بڑے دکھ پہونچے۔ انھوں نے قومی اور بین الاقوامی معاملات میں ہمیشہ حق کی آواز اٹھائی جو عام طور پر صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ ان کا آخری جہاد یہ تھا۔ کہ وہ پچھلے دنوں کی علالت کی حالت میں پاکستان کے فوجی حکمرانوں سے اپنی نحیف آواز جہاں تک ہو سکتا تھا بلند کر کے یہ اپیل کرتے رہے کہ خدا کے لئے اپنے پنجۂ استبداد سے مغربی پاکستان کے عوام کا گلا دبانے اور مشرقی پاکستان کے عوام کا خون بہانے سے باز آجائیں اور ان کے دلوں میں باہمی نفرت کا وہ زہر نہ گھولیں جو جسم کے ساتھ روح کو بھی مسموم کر دیتا ہے مگر ان ظالموں نے ان کی ایک نہ سنی اور جو کرنا تھا وہ کر گذرے اس صدمے سے سیدین صاحب کا دل جسمیں امراض قلب سے پہلے ہی بال پڑ چکا تھا،

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ٹوٹ گیا۔ استعارے میں نہیں حقیقت میں ٹوٹ گیا۔"

(اداریہ اسلام اور عصر جدید جنوری ۱۹۷۲ء ص ۱۴)

(۴) سیدین صاحب کا مبلغ علم :-

سیدین صاحب عربی فارسی، اردو اور فرانسیسی وغیرہ خوب جانتے تھے اور انگریزی داروں پر تو گویا ان کو مکمل قدرت حاصل تھی۔ مشرق و مغرب میں تعلیم اور فلسفۂ تعلیم پر جو اہم کام ہوا ہے وہ ان کی نظر میں تھا علاوہ ازیں ان کے والد مرحوم کی طرح ان کے علمی مذاق کا پھیلاؤ حد درجہ حیرت ناک ہے۔ ایک طرف سقراط، افلاطون، گبن، میکالے، کارلائل، تھیکرے، ڈکنز، ڈوما، مارلے، لیکی، گوئٹے، فروڈ ملٹن، شیکسپیر، ایمرسن، ٹیرز، شلٹ، ہیگل، ہربرٹ، سپنسر، فریڈرک ہیریسن، ڈریپر، کارل مارکس، ٹالسٹائی، نطشے فشٹے، میتھو آرنلڈ، برنارڈ شا، کولرج ٹی ایس ایلیٹ، گوچارنوف، آلڈس پکسلے، پکسلے، رچرڈس، جیمز ہاروے رابنسن آرنلڈ ٹوینبی، شوپنہار، کیلون، ڈارون، ویلس، آئن اسٹائن، نیوٹن، ٹی۔ بی، نن، گلبرک ہائیٹ، میڈم کیوری، میکسوئل، رودرفرڈ، کلرنس ڈیرو، جان اسٹوارٹ مل، لیونارو ڈاونچی برٹرنڈرسل وغیرہ۔

دوسری طرف سعدی، خیام، حافظ، نظیری، عرفی، صائب، محمد ابن یعقوب کلینی جامع کافی، جامع مشکوٰۃ، غزالی، رازی، طوسی، ابن سینا، ابن اثیر، ابن خلدون، ابن حزم، قاضی نوراللہ شوستری، شیخ مفید وغیرہ۔

تیسری طرف قرآن شریف کی تفاسیر، احادیث کا بڑا حصہ، نہج البلاغۃ صحیفہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کاملہ امام زین العابدین، کنفوشس، مہاتما بدھ، مسیح، گرونانک اور دوسرے بانیان مذاہب کے خیالات وغیرہ۔

چوتھی طرف تقریباً تمام مشہور لوگوں کی سوانح عمریاں، تقریباً تمام دائرہ مناظرہ و کلام جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں شیعوں اور سنیوں میں ہوتا رہا ہے۔ پانچویں طرف موجودہ اردو ادب جس کی بنا میر امن نے ڈالی اور جس کو اب ہمارے ناول نویس وغیرہ چلا رہے ہیں۔

چھٹی طرف وہ ادب جس کی بنا سرسید نے ڈالی اور جس کی تکمیل آج کے بہت سے مصنفین، ناقدین اور محققین کر رہے ہیں۔ اس غیر معمول اور سلجھے ہوئے ہمہ گیر مطالعہ کا اثر تھا کہ جب وہ کوئی مقالہ لکھتے یا تقریر کرتے تو ان کے سامنے مضامین اور حوالوں کا ہجوم صف بستہ نظر آتا تھا۔ اس وسیع مگر مربوط اور سنجیدہ فکر کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ ہر قسم کے موضوع پر قلم برداشتہ لکھ سکتے تھے۔ اور تقریر کر سکتے تھے۔ ان کی تقریر و تحریر میں کہیں محض عبارت آرائی یا ٹھونس ٹھانس نہیں ملتی جو کہنا ہوتا تھا۔ وہ ان کے دماغ میں بالکل صاف تھا۔ اس کے دلائل صف بہ صف آراستہ تھے اور وہ اس کو بغیر کسی ذہنی جھجک یا معذرت کے بیان کر دیتے تھے۔

مالک رام صاحب نے ان کے انداز گفتگو کے بارے میں لکھا ہے:

"گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا بلکہ یہاں ہلکا سا مزاح کا پہلو سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے۔ نرم لہجے میں وثوق سے اپنا عندیہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔"

(تذکرہ ہمعاصر)

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(۵) سیدین صاحب کا اسلوبِ نگارش

ان کے علمی مذاق کے اس پھیلاؤ کے باوجود ان کے یہاں اقتباسات کی بے محل بھرمار نہیں ملتی۔ وہ ہمیشہ جذباتی اسلوب کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اردو ہو یا انگریزی وہ ہمیشہ خطیبانہ شاعرانہ یا رنگین اسلوب سے گریز کرتے ہیں ان کے یہاں اشعار کے حوالے، کتابوں کے نام، ادبی و علمی شخصیتوں کے تذکرے، ادبی تحریکوں کے متعلق اشارے ضرور ملتے ہیں۔ جن سے ان کی تحریروں کے وزن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مسل بندی اور واقعات کی کھتونی کے خلاف نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ ہے۔ مگر جذباتیت نہیں وہ جذبے کی تہذیب کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا مقصد لطفِ سخن ہی نہیں بلکہ قدروں کی اشاعت ہے وہ اپنے قارئین سے سنجیدگی اور متانت اور غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ایک صاحب اسلوب انشا پرداز کی حیثیت سے ان کا شجرۂ نثر نگاری بھی حالی سے ملتا ہے۔ وہ حالی اسکول کے بلند ترین نمائندے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی نثر نگاری کے متعلق لکھا ہے۔

"ہندوستان کے مشہور ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ وہ ایک عمدہ نثر نگار اور حالی اسکول کے سچے نمائندے ہیں۔ ان کی کتاب

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اصول تعلیم اپنے فن پر ایک مستند کتاب ہے اور اردو نثر کے سرمائے میں اضافہ ہے۔ اور ان کا مقالہ روح تہذیب جسے اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ نے شائع کیا تھا ان کی علمی اور ادبی بصیرت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ (زاویۂ نگاہ ص ۱۴۱)

ان کی نثر پر پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا یہ قول صادق آتا ہے۔

"مجھے وہ نثر بھلی معلوم ہوتی ہے جس میں خیال آئینے کی طرح واضح ہے جس میں علمیت کا رعب ڈالنا مقصود نہیں علمیت کی گہرائی اور گیرائی ہے۔" (تنقید کیا ہے ص ۱۳)

حالی سے اردو نثر کے اسلوب میں وہی تحریک شروع ہوئی جو انگریزی میں بیکن سے ہوئی اور اس اسلوب کی نمائندگی کا پورا حق سیّدین صاحب نے ادا کیا۔

(۶) سیدین صاحب کی مرقع نگاری

انھوں نے اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" میں صحبت اہل صفا کے عنوان سے حصہ دوئم میں شخصیات کی سیرت کشی کی ہے۔

(۱) سحر آفریں (مہاتما گاندھی)
(۲) میر کارواں (مولانا آزاد)
(۳) شمع محفل (سید راس مسعود)

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(۴) دانائے راز (ڈاکٹر اقبال)
(۵) مرد درویش (خواجہ غلام الثقلین)
(۶) شبنم (مجتبائی خاتون)
(۷) شعلہ مستعجل (سیدہ خاتون)
(۸) مرد مجاہد (جواہر لال نہرو)
(۹) مرد مومن (ڈاکٹر ذاکر حسین)

ان شخصیات کی سیرت کشی میں سیدین صاحب نے صرف خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اور اس کی وجہ کتاب کے آغاز میں "معذرت" کے عنوان سے یہ بیان کی ہے۔

"حصہ دویم میں بعض افراد کی سیرت کشی کی گئی ہے جن میں کچھ مشاہیر شامل ہیں اور کچھ ذاتی دوست عزیز بزرگ یہاں بھی مقصد ان کی سیرت کا تجزیہ اور ان کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کی جانچ نہیں (یہ تو ان کی سوانح نگار کا کام ہے۔) بلکہ ان شریف قدروں کو اجاگر کرنا ہے جن کا جلوہ میں نے ان کی ذات میں دیکھا۔ یہ شاید میری فطری کمزوری ہے کہ مجھے لوگوں کی خوبیوں کو اجاگر کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ اور ان کی کمزوریوں کی کھوج ایک فضول عبث معلوم ہوتی ہے۔" (آندھی میں چراغ ص ۷)

یہ وجہ جو سیدین صاحب نے بیان کی ہے دراصل مرقع نگاری کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

"مرقع نگاری کی تہ میں جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ ممدوح کو لفظ و بیان کے ذریعہ حیات نو بخشنا، اس کی سیرت کے ان گوشوں کو نمایاں کرنا، جن سے مرقع نگار متاثر ہوا ہے اور چونکہ یہ گوشے خارجی عمل اور واقعات کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے لئے لازمی طور پر واقعات کا انتخاب بھی مرقع نگار کو کرنا پڑتا ہے۔ سوانح عمری میں تصویر کو پوری تفصیل کے ساتھ سامنے لانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ایک طور سے معاہدہ ہوتا ہے لکھنے والے اور وسیع پڑھنے والے طبقہ کے درمیان جسے نبھانے کے لئے بھرپور تاریخی شعور کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مرقع نگاری میں تاریخی شعور سے زیادہ انفرادی تاثر اور ردّ عمل مشعل راہ بنتا ہے۔ مختصر رقبہ اور پیمانہ پر کام کرنے کے لئے واقعات کی کھتونی کی بجائے صرف اہم اور معنی خیز اشاروں، وقت کے چند اہم نقطوں اور شخصیت کی بوقلمونی میں سے چند نقوش کو اسیر کر لینے کی ضرورت ہوتی ہے یہ مرقع نگار اور اس شخصیت کے درمیان جس کی تصویر کشی مقصود ہے ایک انفرادی معاملہ ہوتا ہے اور اس لئے اس میں شخصی جذبہ کی کارفرمائی اور رنگ آمیزی لازمی ہو جاتی ہے لیکن اس سے واقعات کی صحت کسی طرح مشتبہ یا مجروح نہیں ہوتی۔ صرف ان کی ترتیب اور ان کے انتخاب میں فرق آجاتا ہے اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم اس تصویر کو ذہن میں رکھ کر اور دوسرے ذرائع سے اگر چاہیں تو مواد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اور اس طرح ان نقوش کی وضاحت کے لئے سلسلہ وار اور معروضی واقعات کا سہارا لیں اور تاریخی اور سوانحی حقائق کو ان نقوش و آثار کی مدد سے بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح مرقع نگار ہمیں ایک عالم اصغر سے دوچار کر دیتا ہے۔ جس کی بنیاد پر ہم عالم اکبر کا قیاس کر سکتے ہیں۔ (ادب اور تنقید ص ۳۳۸)

سیدین صاحب نے ان مرقعوں میں صرف خوبیوں کو اجاگر کیا ہے اور اس کا مقصد بھی بیان کر دیا ہے۔ ان کی معذرت سے قطع نظر اگر ان شخصیات کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا بھی احاطہ کر لیتے تو ان کی رایوں میں اور زیادہ حسن اور توازن پیدا ہو جاتا اور کہنے والا یہ نہ کہہ سکتا تھا ؎

ساقی ے ناب دارد اما در غورد خمار ما ندارد

اس معاملۂ خاص میں بھی ان کو حالی کا سچا جانشین سمجھنا چاہئے۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ حالی کی طرح بامروت ہونے کے باوجود کسی بھی شخصیت کی پہچان بین میں حالی سے زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ ان کا تصور خیر و شر محض جذبات کے سہارے نہیں قائم ہے بلکہ وہ مطلقاً فکر و تعقل کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے انھوں نے ان شخصیات کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے۔ ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کن شریفانہ اور اعلیٰ قدروں کو عزیز رکھتے تھے۔ بعض جگہ ایسے جملے بھی ملتے ہیں۔ جہاں انھوں نے بعض حالات کے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ذکر، بعض اشخاص کی تصویر کشی یا ان حالات و کوائف میں ان اشخاص کے ردعمل سے عام نتائج اخذ کئے ہیں۔ لیکن ان تعمیمات و مفروضات کی صحت اور صداقت سے قطع نظر یہ بات قابل غور ہے کہ وہ شخصیت کے کن رخوں سے زیادہ سے زیادہ اپنا لگاؤ اور ہم آہنگی محسوس کرتے تھے۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خود سیدین صاحب کی شخصیت اور زندگی پر وہ اعلیٰ قدریں کس قدر عکس انداز ہیں جو انھوں نے بعض مشاہیر کی سیرت کشی میں اجاگر کی ہیں۔

وصف نگاری، سماجی پس منظر، ذاتی واقفیت، خیال کی وضاحت اور زبان و بیان کی صحت نے ان مرقعوں کو نہایت اہم اور دلنواز بنا دیا ہے۔ پھر خلوص بے پایاں اور عشق بے کراں نے ان صفات اعلیٰ اور اقدار بلند کی تشریح میں بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں دکھلائی ہیں ؎

تصنیف عشق معنی و ترکیب دیگراست
ما شرح نکتہ ز صد افسانہ می کنیم

چند تراشے ملاحظہ ہوں۔

"جس چیز نے گاندھی جی کو اس دور کا سب سے بڑا ہندوستانی بنایا اسی نے ان کو دنیا کا ایک بلند مرتبہ اور محبوب لیڈر اور بین الاقوامی امن و مفاہمت کا ایک محکم ستون بھی بنا دیا۔ ان کی خاص صفات کیا تھیں؟ ان کی عالمگیر انسان دوستی جو سب انسانوں کو بغیر نسل، رنگ، مذہب، ذات، پات کے بھید بھاؤ کے دل میں جگہ دینے کو تیار تھی۔ ان کی محبت جس کی آغوش

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہر مظلوم بلکہ ہر مجرم تک کے لئے کھلی تھی اور جو اپنے اثر سے دوسروں کے دل میں محبت کا چراغ روشن کر دیتی تھی۔ سب کے لئے نہیں کیونکہ جن دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔ ان کو تو اکثر نبی اور رشی بھی نہیں کھول سکے) ان کی گہری ہمدردی اور دل سوزی جو ہر کسی کے دکھ درد اور محرومی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ انھیں اپنی زندگی تلخ معلوم ہونے لگتی اور انصاف کی لگن جس میں اپنے پرائے کی تفریق نہ تھی۔ اس کمزور، امن دوست انسان نے جس کے پاس نہ فوج تھی نہ دولت نہ دوسرے مادی وسائل تیس سال تک حکومت برطانیہ کی زبردست قوت کا مقابلہ کیا۔ اور اس کے ظلم و تشدد کو جھیلا۔ لیکن اس کے دل میں انگریز قوم کی طرف سے کبھی نفرت یا برائی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ ان کی بہت سی اچھی باتوں اور قومی سیرت کی خوبیوں کو سراہتا رہا اور اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا رہا کہ وہ جس نظام حکومت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں اس میں اور انگریز قوم میں تمیز کرنا سیکھیں۔ انھوں نے ہمیشہ خلوص سے یہ دعویٰ کیا کہ میں انگریزوں کا دوست ہوں۔ لیکن ان کی نیک نیتی کو اس وقت تسلیم نہیں کیا گیا اور ان کی اس "ریاکاری" کی ہنسی اڑائی گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ کہ وہ انگریزوں کے دوست بھی ہوں اور ان کی حکومت کے "دوست" وہ لوگ سمجھے جاتے تھے جن میں بے لاگ تنقید کی بجائے کہ ناگوار ہوتی ہے "جی حضوری" کی صلاحیت ہو اور جو قوم کی بجائے حاکموں کے ساتھ عہد وفا باندھیں لیکن بعد کے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

واقعات نے ان کے دعوے کی سچائی کو ثابت کر دکھایا اور جب حکومت انگریزی نے ان کی تحریک سے متاثر اور مجبور ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کیا تو صرف بدگمانی اور مخالفت بلکہ ظلم اور جبر کی یادیں بھی ایک حد تک مفاہمت میں بدل گئیں۔" (آندھی میں چراغ ص ۹۲)

آگے چل کر انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں نہایت باوزن اور رفیع خیال کا اظہار کیا ہے :-

"گاندھی جی نے اسی حقیقت کو ہمارے دل میں بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ کہ امن کی جنگ کی ذہنیت پر اور نیک نیتی بدنیتی پر اسوقت تک غالب نہیں آسکتی جب تک ہم انصاف کی خاطر ہر قسم کی نسلی اور وطنی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے ظلم اور برائی کے خلاف جنگ نہ کریں۔ خواہ وہ اپنوں میں ہوں یا "پرایوں" میں جب یہ ذہنیت پیدا ہو جائے تو "اپنے" اور "پرائے" کا فرق بھی مٹ جاتا ہے! اور انسانی ایکتا کا تصور حقیقت بن جاتا ہے۔ قرآن شریف میں اس اصول کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ ساتھ دینگی اور پرہیزگاری کا اور ہرگز ساتھ نہ دو گناہ اور ظلم کا" اور اس میں کہیں دور دور بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ ظلم اور زیادتی گوارا ہیں اگر "ہماری" جماعت ان کی مرتکب ہو اور نیکی اور پرہیزگاری بھی مردود ہیں اگر "دوسروں" میں پائی جائیں!" (آندھی میں چراغ ص ۹۳)

مولانا ابوالکلام آزاد کی عصر آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

"ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہونچتی ہے اور اپنی خاص قدریں خاص اصول اور نیک و بد کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے۔ جس کا تسلسل ہزاروں برس سے قائم ہے۔ اور جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے تاریخ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو دی فرنچی۔ جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن اور ہندوستان میں ٹیگور اور گاندھی جی۔ مولنا آزاد بھی اس ہندو مسلم تہذیب کا شاہکار تھے۔ جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی۔ انھوں نے مشرقی تہذیب اور ادب اور علوم و فنون کے ماحول میں تربیت پائی اور مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کی گہرائی اور فکر کے فیض سے اس تعلیم کی حدوں کو اور وسیع کیا اور اس میں جدید علوم اور مغربی فکر کی روح کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا۔ انھوں نے تحریر اور تقریر کے فن میں بے نظیر کمال حاصل کیا تھا۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کی اشاعت بہت موثر اور شگفتہ انداز میں کر سکتے تھے اور کرتے رہے۔ اس اٹھان سے یہ پیشین گوئی کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ ایک جید عالم دین بنیں گے اور مسلمانوں کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

3785

ذہنی اور مذہبی قیادت کا فرض انجام دیں گے۔ لیکن قدرت کو ان سے یہ کام بھی لینا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ قوم کی سیاسی راہبری بھی ان کے نصیب میں لکھی تھی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان دو فرضوں کی انجام دہی میں بڑی حسین ہم آہنگی پیدا کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو انکی تہذیب اور مذہب کی قدروں سے آشنا کیا، ہندوستان کے ایوان مستقبل میں انھیں ان کا مقام دکھایا۔ اور ان مختلف لیکن مربوط فرائض کی تعلیم دی جو ایک مسلمان، ایک ہندوستانی اور انسان کی حیثیت سے جو دنیا کا شہری ہے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری جماعتوں کے مفاد اور بہبود اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں جیسے گوشت سے ناخن کہ ان کا جدا ہونا ناقابل قیاس ہے۔ جب تک سارا ملک آزاد نہ ہو۔ اس میں سے غریبی اور جہالت کو دور نہ کیا جائے عام لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر نہ بنایا جائے۔ جب تک پوری قوم کے دماغ میں علم اور عقل کے چراغ روشن نہ ہوں اور حریم قلب میں انسانیت کا گداز نہ پیدا ہو مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر اپنے مسئلوں کا حل نہیں کر سکتے اپنی کشتی کو اکیلے کھے کر عافیت کے ساحل تک نہیں پہونچ سکتے۔ اس لئے خود ان کی بہتری کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور ایک بہتر سماج بنانے کی تحریک میں کھلے دل سے شریک ہوں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"ساری زندگی سیاست کی منجدھار میں گزارنے کے باوجود انھوں نے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کے لئے کبھی اشتہار بازی سے کام نہیں لیا۔ اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی۔ سیاست کا کھیل کھیلنے والے جو گھٹیا چالیں اور ریشہ دوانیاں اس مقصد کے لئے کرتے ہیں ان سے اپنے وقار اور عظمت کو آلودہ نہیں کیا۔ سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے عوام کے وقتی جذبات اور تعصبات کے لئے مائیکروفون نہیں بنے۔ گمراہ عوام کی سطح پر نہیں اترے بلکہ کبھی ناصح شفیق کی محبت اور سمجھ داری کے ساتھ، کبھی پیغمبرانہ جرأت اور للکار کے ساتھ انھیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ سیاست کے طوفانوں میں انکے قدم پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ مثلاً وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے اور اس کو ہندوستان اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ اور خطرناک سمجھتے تھے۔ جب مجبوری اور مصلحت کے تقاضوں سے قوم کے دوسرے بڑے نیتا اس عمل جراحی پر آمادہ ہو گئے اس وقت بھی ان کی رائے کے ثبات میں فرق نہ آیا۔ ان میں خیال اور عقیدے کی بے پناہ جرأت تھی۔ اور اس کے اظہار میں کوئی خوف یا مصلحت اندیشی ان کی زبان یا قلم کو نہیں پکڑ سکتی تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی اس سارے جہاد میں ان کی کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔ لالچ اور موہ کا میل نہ تھا۔ نہ روپیہ کی کمانے کی خواہش تھی۔ نہ قوت حاصل کرنے کی۔ بس حق دوستی اور حق پرستی کا ایک شدید جذبہ تھا کہ قوت محرکہ کا کام کرتا تھا۔

پھر وہ ڈرتے تو کس سے ڈرتے اور کیوں؟ انجیل مقدس میں لکھا ہے۔ کہ خدا کا خوف عقل کی ابتدا ہے اور قرآن کی تعلیم ہے کہ خوف الٰہی اور تمام خوفوں سے نجات دلاتا ہے۔ پہلے سرچشمہ سے انھوں نے عقل کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

روشنی حاصل کی تھی اور دوسرے سے ذہنی اور اخلاقی جرأت کا چراغ روشن کیا تھا۔ جب جرات کے ساتھ خلوص اور بے غرضی شامل ہوجائے تو انسان میں بے پناہ اخلاقی جرأت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ایک سپاہی کی ضرب کارسپاہ کر دکھاتی ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں مولانا کی ایسی ہی پوزیشن تھی یہی بھید تھا قوم کے مشورتی ایوانوں میں ان کی آواز کی قوت کا اور اس اعتماد کا جو مختلف گروہوں کو ان کی ذات پر تھا خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی برسرپیکار رہیں۔ اقلیتیں ان پر بھروسا کرتی تھیں اور اکثر ان کی بات ماننے پر راضی ہوجاتی تھیں کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کریں گے ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ جہاں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی اور وطنی زندگی اور فرائض میں ہم آہنگی اور وحدت کا احساس پیدا کیا۔ وہاں انھوں نے مشرق و مغرب کی تہذیبی قدروں میں بھی کسی بنیادی تضاد کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے مطالعے کی گہرائی اور فکر کے فیض سے اپنی روایتی تعلیم کی حدوں کو نئی وسعت بخشی اور اس میں جدید علوم اور مغربی فکر اور فلسفے کی روح کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا۔ ان کی خلاق طبیعت نے مغرب کی بہترین قدروں کو اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج بن گئی۔ ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضع داری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، انسان دوستی، فعالیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اس طرح ان کی ذات نے ماضی اور حال کے درمیان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کیا وہ ایک زبردست عالم دین تھے۔ لیکن "ملا" کی روایتی تنگ نظری سے آزاد، فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے ان کا مسلک گویا یہ تھا۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشۂ نظر کا فساد (ص ۱۰۱)

آخر میں انھوں نے مولانا کے کمالات کو اس ایجاز اور اس اختصار سے بیان کیا ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے دفتر درکار ہیں:۔

"اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا؟ وجاہت ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی۔ دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی۔ دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا ہر چیز کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور نقطوں سے کام لیا شعلہ و شبنم کا، رزم و بزم کا، پھول اور تلوار کا مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکر حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے یہ تھے مولانا آزاد ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا؟ بقول حالی ؎

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ملک یک سر ہوا ہے بے آئیں
اک فلاطوں نہیں جو یونان میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رماں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں (ص ۱۰۶)

سر راس مسعود سے سیدین صاحب کی پہلی ملاقات ۱۹۲۲ء میں ہوئی اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس سراپا باغ و بہار شخصیت کی تصویر کشی اس طرح کی ہے۔

چنانچہ اپنے ایک دوست خواجہ سرور حسن کے ساتھ جو اس زمانے میں حیدرآباد میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں پہونچا۔ ہم ان کے کتب خانے میں جاکر بیٹھے جہاں ہزاروں کتابیں نہایت سلیقے کے ساتھ الماریوں میں لگی ہوئی تھیں ان میں سے اکثر کی نہایت خوشنما اور دیدہ زیب جلدیں انھوں نے اپنے خاص اہتمام سے بندھوائی تھیں۔ ان کے حسن مذاق کی یہ پہلی جھلک تھی جو میں نے دیکھی لیکن رفتہ رفتہ جب ان سے ملنے کے زیادہ موقع ملے تو اندازہ ہوا کہ ان کی گوناگوں دلچسپیوں کے ہر شعبہ میں، ادب میں، آرٹ میں موسیقی میں، فن تعمیر اور مکان کی آرائش میں، باغ کی چمن بندی میں، غرض ہر جگہ یہی حسن مذاق کارفرما تھا۔..... چند ہی منٹ بعد ایک وجیہ اور شاندار شخص کمرے میں داخل

CC-0, In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہوا، اونچا قد، سڈول جسم، گورا رنگ، انگریزوں کی طرح ایک زیتونی جھلک لئے ہوئے، پیشانی کشادہ جس سے دماغ کی وسعت اور فراخی ظاہر ہوتی تھی۔ آنکھیں بڑی اور روشن جن سے بیک وقت سنجیدگی اور ظرافت ٹپکتی تھی، بشرے سے عزم اور استقلال آشکار اور چہرہ ذہانت اور ذکاوت کا آئینہ دار..... یہ تھے سید راس مسعود۔ ص ۱۱۷

راس مسعود کی خوش بیانی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"واقعہ یہ ہے کہ ان کا سا خوش بیان آدمی میں نے ہندوستان کیا کسی ملک میں بھی نہیں دیکھا۔ چسٹرٹن کا قول ہے کہ آرٹ مبالغہ کا نام ہے۔ چھوٹی سی بات کو زیب داستان کے لئے بڑھا کر استعمال کرنا راس مسعود کا حصہ تھا۔ ان کی ذات ہر محفل میں رونق محفل ہوتی تھی جس صحبت میں پہونچ جاتے نسیم بہار کی طرح دلوں کو شگفتہ کر دیتے۔ ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی ہوا نہ بندھتی تھی۔ ان کے پاس قصے کہانیوں، حکایتوں اور لطیفوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا۔ جن کو وہ نہایت لطیفے کے ساتھ برمحل استعمال کرتے تھے۔ تقریر کی روانی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص مبارزانہ انداز میں کوئی عجیب وغریب قصہ سناتا یا شیخی بگھارتا تو وہ فوراً ہی ایک عجیب تر داستان تصنیف کر کے سنا دیتے۔ ان کی ظرافت بے امان تھی لیکن اس میں دل آزاری یا تحقیر کا شائبہ نہ ہوتا تھا۔ خشک مزاج اور خر دماغ لوگ خاص طور پر اس کا نشانہ بنتے تھے۔

ایک معلم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے راس مسعود کی وصف نگاری اس

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

طرح کی ہے۔

"مگر دو صفات ان میں ایسی تھیں جن کی بدولت انھوں نے معلم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے نمایاں کامیابی حاصل کی ایک طرف وسعت مطالعہ اور سلامت ذوق نے ان کے ذہن کو پاکیزہ خیالات، برجستہ اشارات برمحل حکایات اور تلمیحات کا مخزن بنا دیا تھا اس لئے ان کی گفتگو حلقۂ درس ہو یا صحبت احباب سننے والوں کے لئے ایک روحانی نعمت تھی دوسری، انکی شخصیت کا خلوص اور دلکشی، ان کی بے مثل ظرافت اور سچا جوش، جس میں آخر عمر تک شباب کی تازگی قائم رہی نوجوانوں کو مقناطیس کی طرح کھینچتا تھا۔ ڈسپلن قائم کرنے میں انھیں کبھی دقت نہ ہوئی، طالب علموں سے وہ انتہائی شفقت اور محبت سے پیش آتے اور وہ بھی ان سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ بھلا کس طالب علم کا سر پھرا تھا کہ ایسے شفیق اور ہمدرد استاد سے جو نوجوانوں کی نفسیات کا ماہر تھا اور ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں دل وجان سے شریک مگر یہ وہ اوچھی ہر دلعزیزی نہ تھی جو بعض استادوں کو اس درجہ سے حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا کوئی خاص ذہنی رنگ نہیں رکھتے بلکہ شاگردوں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں راس مسعود ادب، آرٹ شاعری تاریخ، نفسیات غرض ہر قسم کے تہذیبی اور تمدنی مسائل سے ذوق رکھتے تھے ان کی نظر مدرسہ کی چار دیواری میں مقید نہ تھی۔ کتابوں کے مطالعے انسانوں کے ساتھ عملی لین دین اور معاملات کے تجربے نے انھیں زندگی کے وسیع تر دائرے سے آشنا اور ان کی منفرد شخصیت کو گوناگوں صفات سے مالا مال کر دیا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تھا قدرتاً ایسی شخصیت کا فیض نسیم بہار کی طرح ان کے طلبہ کے تھکے ہوئے دل و دماغ کو فرحت و تازگی بخشتا تھا۔"
(ص ۱۱۳)

سر راس مسعود کی ایک اور اہم صفت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"سر راس مسعود کو ہر قسم کی تنگ دلی، تعصب اور نفرت تھی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، ہندستانی، انگریزی، فرانسیسی، جاپانی ہر نسل اور مذہب اور حیثیت کے لوگ ان کے دوستوں میں شامل تھے اور ان کا دل اتنا بڑا تھا کہ اس میں دوستوں، عزیزوں، نوکروں، ملاقاتیوں بلکہ مخالفوں کے دکھ درد کے لیے بھی جگہ تھی علی گڑھ میں کئی سال تک میرا ان کا ساتھ رہا اور میں نے انہیں جلوت اور خلوت دونوں میں دیکھا اور ہمیشہ یہ پایا کہ اس شریف اور دل والے انسان نے کبھی روپے، پیسے، وقت، سفارش، ہمدردی کے معاملے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا دل ضرورت سے زیادہ نازک اور حساس واقع ہوا تھا۔"

(ص ۱۲۱)

صحبتِ اقبال کے بارے میں ان کی رائے نہایت دقیع ہے:۔

"اقبال کا ایک شعر ہے ؎

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اقبال کی صحبت میں ایسی ہی ایک بارگاہ کی شان نظر آتی تھی۔ ان کا دربار امیروں اور رئیسوں کے دربار سے بالکل مختلف تھا وہاں نہ پاسباں کی اجازت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تھی نہ اجازت طلبی کی ضرورت۔ نہ چھوٹے بڑے، گمنام نامور، دیسی بدیسی، جاہل عالم، غریب امیر، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کی کوئی تمیز۔ ان کے گھر کی طرح ان کے دل کے دروازے بھی تمام انسانوں کے لیے کھلے ہوئے تھے مگر اس میں مختلف لوگوں کے لیے الگ الگ خانے نہ تھی۔ ہر طرح کے لوگ ان کے پاس آتے اور اس چشمۂ فیض سے اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہو کر جاتے۔ بعض علمی، سیاسی، فلسفی، مذہبی مسئلوں پر گفتگو کرنے آتے۔ بعض مقامی معاملات کے بارے میں مشورہ کرنے، بعض ان کی گفتگو سے لطف اٹھانے اور ان کے شوخ لطیفوں اور قصوں کو سننے، بعض محض گپ کرنے اور حقہ پینے اور بعض شوق زیارت میں۔ کئی مرتبہ یہ تماشا دیکھا کہ وہ اپنے برآمدے میں ایک نیم شکستہ مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور ہر طرح کے لوگ طالب علم، پروفیسر، مغرب کے ارباب علم وادب، سوسائٹی کی مشاہیر نواز خواتین، گاؤں کے جاہل لیکن عقیدت مند ملاقاتی ان کے پاس آتے اور وہ سب سے ان کی عقل اور دلچسپی کے مطابق تپاک کے ساتھ باتیں کرتے اور ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے۔ نہ کسی کی جہالت اور آداب مجلس سے ناواقفیت پر چیں بہ جبیں ہوتے نہ کسی کی قابلیت اور وجاہت سے مرعوب۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی مشہور غیر ملکی مفکر سے فلسفہ یا ادب کی گہری حقیقتوں پر گفتگو کر رہے ہیں اور بیچ بیچ میں ان کے نیم جاہل ملاقاتی، جن کو اس گفتگو کی سمجھ ہوتی نہ اس میں دلچسپی، حقے کی نے کو ان کی طرف موڑتے اور سلسلۂ کلام کو بے تکلفی سے توڑ کر کہتے،

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ڈاکٹر صاحب تم حقہ پیونا، اور ڈاکٹر صاحب فلسفے کو ملتوی کر کے ان سے ایک دو باتیں کرتے یا ایک آدھ نقرہ چست کرتے۔ اور پھر اپنی سنجیدہ علمی گفتگو میں مشغول ہو جاتے۔ اس وقت ان کا دماغ کبھی علم و ادب کے خزانے لٹاتا کبھی تاریخ اور فلسفے کے رازوں کو بے نقاب کرتا کبھی ایک تیز نشتر کی طرح زندگی پر تنقید کرتا اور سماجی ناسوروں سے فاسد مادّے کو خارج کرتا۔ کبھی اہل سیاست کے بلند آہنگ دعوؤں اور ریاکاریوں کا پول کھولتا۔ لیکن اس تنقید میں نہ مردم بیزاری تھی نہ مردم آزاری، ہاں شوخی اور ظرافت ہوتی، برتر فکر اور بہتر زندگی کی ترجمانی ہوتی اور گدازِ قلب کی دھڑکن، اور یہی جذبہ ان کی شاعری میں جاری و ساری ہے جب کوئی صاحب ذوق یا باعلم شخص ان کی صحبت سے اٹھتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ذہن اور زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔" (ص ۱۳۰)

اپنے والد مرحوم خواجہ غلام الثقلین کی اس کردار نگاری سے کی ہے :-

"ان کی زندگی اور اس سے بھی زیادہ ان کے انداز فکر کا مطالعہ کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ ان کی فطرت کی تعمیر بھی اسی قسم کی مٹی سے ہوئی تھی جو سقراط یا گلیلیو یا جون آف آرک جیسے لوگوں کے ذہنی خمیر میں شامل تھی۔ ان کے زمانے تک قومیں رواداری کے بعض آداب سیکھ چکی تھیں (گو اس زمانے میں وہ پھر بھلائے جا رہے ہیں) ورنہ شاید وہ بھی سقراط کی طرح زہر کا پیالہ ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ پی جاتے۔ یا گلیلیو کی طرح

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سچ کی شہادت دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگ میں جلا دیتے۔ اس لیے ان کے نصیب میں بسا اوقات بدگمانی، مخالفت اور بدزبانی کی دولت ہی آئی جس کو انہوں نے "کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات" سمجھ کر نوش جان کیا۔ انہیں کام کرنے کی جلدی تھی اور ایک طرح کی بے صبری۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ زندگی ان کو بہت کم مہلت دے گی اس لیے جو کچھ بھی ہو سکے اسے اپنی جان پر کھیل کر شمع حیات کو دونوں طرف سے جلا کر جلد سے جلد انجام دینا چاہیے۔ وہ پبلک کام کرنا چاہتے تھے لیکن لیڈری کے بیش تر گر دن سے ناواقف تھے یا ان کو قابل اعتبار نہ سمجھتے تھے وہ خوشامد اور حکام رسی سے بھی اتنے ہی دور تھے جس قدر عوام کو خوش کر کے یا ان کے جذبات کو بھڑکا کے ہر دل عزیزی حاصل کرنے سے، جس وقت بیشتر تعلیم یافتہ لوگ دنیاوی عزت اور وجاہت کی طرف جھکتے تھے اور اپنے (یا اپنے متعلقین اور جماعت) کے لیے نوکریاں حاصل کرنا شخصی اور قومی معراج سمجھتے تھے ان کی توجہ عوام کی خدمت کی طرف تھی اور وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے ان میں تعمیری کام کرنے کو ان کی اقتصادی حالت درست کرنے کو اور ان کی سیرت سازی کو۔" (ص ۱۵۴)

اسی سلسلے میں آگے چل کر اس طرح لکھتے ہیں :-

"ان میں بعض صفات وہ نہ تھیں جو کامیاب لیڈری کے لیے ضروری ہیں لیکن بے غرض اور بے لاگ خدمت کرنے کے لیے (اگر وہ سچی لیڈری سے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کوئی جداگانہ چیز ہے) سب سے اہم صفت ہے اخلاقی جرأت جو ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جو قومی لیڈر اور کارکن اپنے فرایض کو ایمان داری کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے ـــــ ایک محتسب کے انداز میں ان سے باز پرس کرتے تھے لیکن اس میں کبھی نفسانیت کا شائبہ نہ ہوتا تھا ممکن ہے بعض مصلحت پرست لوگ کہیں کہ ان کی یہ خصوصیت خوبی کی حد سے گزر کر ایک عیب بن گئی تھی کیونکہ وہ بغیر نتیجہ کا خیال کئے سچی بات کہتے اور ہر قومی اور جماعتی کمزوری پر بے امان تنقید کرتے تھے لیکن دراصل ان کی کمزوریاں بھی ان کی خوبیوں اور اصول پرستی کا نتیجہ تھیں"۔ (ص ۱۷۰)

مجتبائی خاتون عرف مجّی (مسز خواجہ احمد عباس) کی سیرت نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"جب تک وہ زندہ رہی بڑی بہادری اور خاموشی سے موت سے لڑتی رہی دل کی موذی بیماری سے، جس نے اس کی زندگی کو پر تلخ کر دیا تھا، میں نے کسی کو اس بہادری، خندہ پیشانی اور کرامت کے ساتھ یہ لڑائی لڑتے نہیں دیکھا، لوگوں کی انگلی میں پھانس چبھ جاتی ہے تو ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو جاتی ہے زکام ہو جاتا ہے تو وہ زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں لیکن مجّی کے لیے مدّت تک چلنا پھرنا بند رہا۔ رات کی نیند اور دن کا چین ایک خواب پریشاں ہو کر رہ گیا۔ زندگی گزارنے کے جو نقشے بنائے تھے، معلّمی کا جو منصوبہ مرتب کیا تھا، امیدوں کے جو پیکر تراشے تھے، سب نا امیدی میں بدل گئے۔ لیکن اس کے مزاج میں تلخی پیدا نہیں ہوئی شکست کا جذبہ نہیں ابھرا پشیانی پر شکن نہیں آئی تمام آزمائشوں میں ہونٹوں پر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

مسکراہٹ کھیلتی رہی اور دوسروں میں دلچسپی، ان کی خدمت، ان کے آرام کا خیال، ان سے محبت اس کے حریم قلب میں ایک شمع کی طرح روشن رہی۔ خدا کی اس دین نے اس کی دکھوں سے مالا مال زندگی کو فروزاں رکھا اور اس کی روشنی دوسروں کی زندگی کو جگمگاتی رہی۔ اس نے ہر قسم کی تکلیفوں اور آزمائشوں میں صبر کی وہ شان دکھائی جو مومنوں اور خدا کے خاص بندوں کا حصہ ہے۔ اس کی مثال ان بزدل اور کم ہمت لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے جو ذرا سی تکلیف میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں جن کو نہ خدا پر بھروسا ہوتا ہے نہ خود پر"! (ص ۲۰۷)

سیدین صاحب نے اپنی بہن سیدہ خاتون کی سیرت نگاری "شعلۂ مستعجل" کے عنوان سے ـــــ کی ہے جو اس مرگی پر افسوس کرتے ہوئے ان کی صفات کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے کی آخری سطور میں سیدین صاحب نے بڑی فکر انگیز باتیں کہی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت میں کس قدر امکانات خوابیدہ ہوتے ہیں اور کس قدر ذمہ داری کا بار اٹھانے کی قوت ہوتی ہے:۔

"اسی محبت کا فیض تھا کہ اس کم عمری میں اس نے ایک ایسا کارنامہ دکھایا جو آج تک مجھے حیرت میں ڈالتا ہے۔ جب ہم بھائی بہنوں کے سر سے بچپن ہی میں اس شفیق ماں کا سایہ اٹھ گیا جس نے ہمیں اپنے ظلّ عاطفت میں رکھا تھا اور دنیا کے حوادث اور تلخیوں سے بچایا تھا۔ تو ہمیں ایسا معلوم

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہوتا تھا کہ زمین و آسمان کی جڑیں اور زندگی کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ لیکن اس بیس سال کی نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکی نے نہ صرف گھر کی زندگی کا بار اٹھا لیا بلکہ ہمارے ویران دلوں میں اپنی محبت اور فرزانگی سے اس طرح گھر کر لیا کہ ایک حد تک ماں کی جدائی کا زخم مندمل ہو گیا۔ خدا کی قدرت اور رحمت کا پورا اندازہ ایک عورت کے دل کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں کس قدر امکانات خوابیدہ ہوتے ہیں کس قدر ذمہ داری اٹھانے کی قوت ہوتی ہے۔ بچپن میں اس کے مزاج میں کس قدر تیزی اور زود رنجی تھی لیکن جوں جوں عمر اور تجربہ بڑھتا گیا اس میں گھلاوٹ اور شیرینی اور سکون و وقار زیادہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ماں کے انتقال کے بعد اس کی حساس طبیعت اس قدر مستحکم اور اس کے دل کی محبت ایسی اتھاہ ہو گئی تھی کہ اگر تمام دنیا کے دکھ درد کا بوجھ اس پر ڈال دیا جاتا تو وہ اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہہ لیتی اور اُف نہ کرتی۔ کم سے کم مجھے تو اس کی ذات سے ایسی ہی تقویت تھی جب آزمائشوں اور پریشانیوں کی کثرت زندگی کو ناگوار اور تلخ بنا دیتی تو اس کا ہنستا ہوا خوبصورت چہرہ اور نیلگوں آنکھیں دل کے بار کو اس طرح دور کر دیتی تھیں جس طرح سورج کی روشنی رات کی تاریکی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کو کافور کر دیتی ہے مگر قدرت کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں اپنی صلیب تنہا اٹھائے اور کسی رفیقِ صادق کی مدد اور محبت اس کی کٹھن منزل کو آسان نہ کرے اور انسان کی یہ دعا یا تو پوری ہی نہیں ہوتی کہ ؎

خواہم از لطف تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

یا اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو اس یار ہمدم کو یک لخت ہم سے چھین لیا جاتا ہے تاکہ ہم جانیں کہ ہر چیز کو فنا ہے اور باقی رہنے والی محض ذاتِ باری ہے۔" (ص ۲۳۵)

(۷) سیدین صاحب کی مکتوب نگاری ؎

مایہ مہر و محبت از رواج افتادہ بود
صحبت ما روز بازار وفا را گرم ساخت

ڈاکٹر عابد حسین صاحب ان کی مکتوب نگاری کے متعلق لکھتے ہیں :-

" اردو خط و کتابت کی تو کچھ نہ پوچھئے، ہر خط کا جواب دینا واجب اور خود ہر چھوٹے بڑے عزیز اور دوست کو خط لکھنا مستحب سمجھتے تھے۔ ایک مدت سے یہ معمول تھا کہ اپنی اور دوسروں کی مذہبی تقریبوں کے موقع پر عید کارڈ یا کرسمس کارڈ وغیرہ کے بجائے خاصے طویل گشتی خط بھیجتے تھے جن میں عرض حال اور پرسش احوال کے علاوہ مسائل حاضرہ پر حکیمانہ اور دردمندانہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ انتقال سے دو تین روز پہلے انہوں نے اس طرح کے کرسمس نامے ہندستان اور دوسرے ملکوں میں کوئی دو سو دوستوں کے نام بھیجے۔"

سیدین صاحب کے خطوط ہوں یا مضامین دونوں میں اسلوب کی وہ شان جلوہ گر ہے جسے مڈلٹن مرے "زبان پر فتح" کہتا ہے اور جو بقول پروفیسر آل احمد سرور بڑی مشکل سے اور بڑی دیدہ دری کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ایک مغربی نقاد کا خیال ہے کہ اب شاعری کی بجائے نثر کی حکومت ادب پر ہوگی۔ اس حکومت میں جہاں مضمون نگاری، تنقید، تاریخ کا دور دورہ ہوگا وہاں خطوط کی اہمیت بھی روز بروز بڑھتی جائے گی۔ سیدین صاحب کے خطوط بھی اسی حیثیت کے ہیں۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے خطوط کے نقوش کچھ کم مفید نہیں۔ میرے پاس کم سے کم ان کے ڈیڑھ سو خطوط محفوظ ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں مجھے لکھے ہیں۔ ایک خط بطور نمونہ پیش کرتا ہوں انہوں نے مجھ سے فارسی میں بعنوان "ایران و ہند" نظم لکھنے کی فرمائش کی تھی اور یہ بھی چاہا تھا کہ میں وہ نظم جناب کاردوش صاحب کو پیش کر دوں۔ میں نے وہ نظم [illegible] کر کاردوش صاحب کی خدمت میں پیش کی جو انہیں [illegible] ازیں مجھے اسرار و رموز کا ۱۹۲۸ء کا ایڈیشن چاہیے [illegible] تھے تاکہ سیدین صاحب انہیں مذکورہ بالا ایڈیشن [illegible] جواب دیں، اس سلسلے میں سیدین [illegible] [illegible] ۱۹۷۸ء [illegible]

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

حسب ذیل ہے :-

"عزیزی تسلیم !

آپ کا خط ایک عرصہ ہوا ملا تھا میں اس عرصہ میں کچھ مصروف اور کچھ پریشان اور رنجیدہ رہا۔ خاص طور پر اپنے چھوٹے بھائی کی موت کی وجہ سے طبیعت ہی صاف نہیں رہی۔ اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔

شکر ہے کہ آپ کی فارسی نظم کا ردوش صاحب نے پسند کی۔ امید ہے کہ اس وساطت سے آپ کے اور ان کے مراسم مضبوط ہو جائیں گے۔ میرے پاس اسرار و رموز کا ۱۹۲۸ء کا ایڈیشن ہے اور اس میں یہ اشعار یقیناً موجود ہیں اور میرا خیال ہے کہ بعد کے ایڈیشنوں میں بھی ہوں گے۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ مخلص

خواجہ غلام السیدین

(۸) اردو سے عشق

سیدین صاحب کو اردو سے عشق ورثے میں ملا تھا۔ وہ اردو کی حمایت اور اہمیت ظاہر کرنے کا کوئی موقع نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اردو کا ذکر ان کے لیے "نعمان کا ذکر" تھا جس کے لیے عربی شاعر کہتا ہے ؎

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہٗ

ھو المسک ما کررتہ یتضوع

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(نعمان کا ذکر ہمارے سامنے بار بار کرو اس لیے کہ وہ مشک کی طرح ہے اور مشک کو جتنی بار سونگھو وہ مہکتا اور خوشبو دیتا ہے)

انہوں نے دہلی یونیورسٹی میں نظام خطبات کا آغاز کرتے وقت اردو کی اہمیت اس طرح جتائی تھی:-

"میرے یہ کشش کہ خطبات اردو زبان میں دیتے ہیں۔ میں ہندستان کی سب زبانوں کو قومی زبانیں سمجھتا ہوں اور سب کی ترقی اور خدمت میری مشترکہ ہندستانی تہذیب کو مالا مال کرتی ہے، کیونکہ اسی کی آواز ہے جو سب کے گلے سے نکلتی ہے لیکن اردو مجھے خاص طور پر اس لیے عزیز ہے کہ وہ میری مادری اور ثقافتی زبان ہے اسی میں میں نے سب سے پہلے بولنا اور لکھنا سیکھا اور اس کے ذریعہ ادب سے لطف اندوز ہونے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوئی۔ یہ ہندستان کی ایک پیاری اور خالص سودیشی زبان ہے اس نے اپنے کیسے میں دوسری زبانوں کے خزانے سے بہت کچھ لیا ہے اس لیے مجھے بعض دفعہ افسوس ہوتا ہے کہ بعض سیاسی مخالفتوں یا مصلحتوں کی وجہ سے ہم نے اس کو فراخدلی کے ساتھ نہیں اپنایا، جیسا اس کا حق ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اب بادل چھٹتے جاتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اردو اپنی مادر وطن کی خدمت میں شایانِ شان حصہ لے سکے گی۔"

(فکر انسانی کا سفر از تقار ص ۳۲)

حقیقت یہ ہے کہ سیدین صاحب نے اپنے افکار و خیالات سے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ انہوں نے اردو میں نہایت بلند فلسفیانہ اور مفکرانہ خیالات کا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ "جہانِ تازہ" کی "نمود" افکارِ تازہ سے ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

سیدین صاحب کے افکار و تصوّرات میں اس قدر وسعت و تنوع ہے کہ ان کا جائزہ لینا آسان نہیں پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ ان کی تصانیف کی روشنی میں چند امور کی وضاحت کر دوں۔

ابوالکلام و اقبال سے عقیدت

سیدین صاحب کو ابوالکلام اور اقبال سے بدرجۂ اتم عقیدت تھی۔ یہ امر ان حضرات کے لیے بلاشبہ لمحۂ فکریہ بن جاتا ہے جو ابوالکلام اور اقبال میں افکار و تصوّرات کے لحاظ سے بعد المشرقین مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چند سیاسی معاملات سے قطع نظر اقبال اور ابوالکلام کی فکر کے سوتے ایک ہی سرچشمے سے پھوٹتے تھے۔ اس لیے افکار و تصورات کی دنیا کے ایک بڑے حصّے میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ مثلاً غبارِ خاطر میں ابوالکلام نے اقبال کا ایک شعر درج کیا ہے جو غالباً انہیں معلوم بھی نہ ہو کہ یہ اقبال کا شعر ہے ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کار ایست کہ بی آہ و فغاں نیز کنند

غبارِ خاطر میں ۔۔۔ اضطراب پر ابوالکلام کا تبصرہ (صفحہ ۱۲۱) کا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

آخری جملہ کہ موج جب تک مضطرب ہے زندہ ہے۔ آسودہ ہوئی اور مردہ ہوئی۔ اقبال کے مرکزی افکار میں سے ایک ہے جسے انہوں نے طرح طرح سے کہا ہے:۔

"موج زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت" والا قطعہ

اسی طرح ابوالکلام کے بہت سے افکار اور جملے اقبال سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ عجمیت کے اباطیل و خرافات اور غیر اسلامی تصوف کے مکروہات سے دونوں بیزار نظر آتے ہیں اور دونوں کا منبع فکر قرآن مجید ہے۔ سیدین صاحب کی طرح ابوالکلام کو بھی اقبال کی شاعری پسند تھی اس کا اعتراف انہوں نے الہلال کی کسی ابتدائی اشاعت (شاید اولین اشاعت) میں عربی والی نظم سرورق شائع کر کے کیا تھا۔ اقبال ہمیشہ اپنی کتابیں ابوالکلام کو بھیجتے تھے اور وہ انہیں پسند کرتے تھے۔ دونوں میں باہم خط و کتابت رہتی تھی۔

اقبال نے سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"آج مولینا ابوالکلام کا خط آیا ہے انہوں نے میری اس ناچیز کوشش (مثنوی رموز بے خودی) کو بہت پسند فرمایا ہے"

(۲۸ اپریل ۱۹۱۹ء)

ابوالکلام کی نظر میں شاعری کی حیثیت سے اقبال کا مقام کتنا بلند تھا اس کا اندازہ مولانا ملیح آبادی کے بیان سے ہوتا ہے۔ مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:۔

"لیکن اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مصر کے شاعر احمد شوقی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پاشا کو ہر حلقوں نے امیر الشعراء کا خطاب دیا تھا

اس پر مولانا کو خیال ہوا کہ ہندستان میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ملک الشعراء بنا دیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا کیا ڈاکٹر اقبال اس خطاب کے اہل نہیں ہیں؟ عرض کیا، ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ کمالات کے معترف آپ ہیں مجھے شاعری سے ذوق نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاسیات کے مخالف ہیں۔ ملک الشعراء بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں۔ مولانا سوچ میں پڑ گئے اور میں کہتا رہا، اخبار کے مالک آپ ہیں اور جو تجویز چاہیں پیش کر سکتے ہیں لیکن جب تک ایڈیٹر میں ہوں اپنے ضمیر کے خلاف کسی تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا نام ایڈیٹری سے الگ کر دیا جائے اس کے بعد بھی اخبار کی خدمت جاری رکھوں گا۔ یہ سن کر مولانا نے ہاتھ کے کاغذ پھاڑ ڈالے اور فرمایا، آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمیں یہ تجویز پیش نہیں کرنا چاہیے۔"

(ذکر آزاد مطبوعہ کلکتہ از ملیح آبادی ص ۳۱۲)

اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابوالکلام اپنی نظر میں اقبال کو ملک الشعراء بنائے جانے کے قابل سمجھتے تھے۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اقبال نے سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھا تھا جس میں "تذکرہ" کے مقدمہ نگار مسٹر فضل الدین کی شکایت کی تھی۔ مسٹر فضل الدین نے لکھا تھا کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔ اقبال کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور سید سلیمان ندوی سے اپنے مذکورہ خط میں تذکرہ کیا۔ سید صاحب نے یہ خط یا اس کا متعلقہ مضمون ابوالکلام کو بھیجدیا۔ انہوں نے جواباً سید صاحب کو خط لکھا جس میں تحریر کیا۔

"ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں ہے ..... لطف یہ ہے کہ اس مرتبہ جب وہ (مسٹر فضل الدین) جلسے کے موقع پر آئے اور میں نے ان سے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیوں کر تبدیلی معلوم کی تو انہوں نے خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صرف یہی تھی کہ اقبال پہلے آجکل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور دونوں مثنویوں میں جو باتیں ظاہر کرنی چاہتے ہیں وہ ہیں جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں"

(۲ جنوری ۱۹۲۰ء)

ان مکتوبات سے ظاہر ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا کس قدر اعتراف اور کس قدر پاس خاطر تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سیدین صاحب کو ابوالکلام اور اقبال دونوں سے عقیدت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں "ایک عالمگیر تصور انسانیت" کے قائل تھے اور یہی چیز سیدین صاحب کے لیے وجہ کشش تھی۔ اسی نقطۂ نظر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کی ترجمانی کرتے ہوئے مولینا ابوالکلام آزاد کے متعلق سیدین صاحب لکھتے ہیں:-

"لیکن مولانا آزاد کی نظر اپنی جماعت تک محدود نہیں رہی ان کا ذہنی اور جذباتی الحاق ان کے اپنے الفاظ میں ایک عالمگیر تصور انسانیت کے ساتھ تھا۔ وہ ہر مسئلے کو ایک انسانی مسئلہ سمجھتے تھے اور خیر و شر کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ایک ناقابل تقسیم میراث! سورہ فاتحہ کی تفسیر میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب ایک مرد مومن خدا کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو وہ ایک سیدھے اور سچے راستے پر چلنے کی دعا مانگتا ہے جو تاریخ انسانی میں سچ کے سیوکوں اور پرچارکوں کا مشترک راستہ رہا ہے نہ کہ کسی خاص قوم یا گروہ یا نسل کا اور جب وہ ظلم اور برائی کے راستے سے پناہ مانگتا ہے تو وہ بھی ان تمام لوگوں کے راستے سے خواہ وہ کسی قوم یا جماعت یا نسل کے ہوں، جنہوں نے سچائی سے منہ موڑا اور ظلم اور نافرمانی کی دلدل میں جا پھنسے۔ جو شخص اس بلند اور ہمہ گیر تصور کو علم بنا کر کارواں کی قیادت کرے گا اس کے دل اور دماغ کے کسی گوشے میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، ہندی اور غیر ہندی، کالے اور گورے، مشرقی اور مغربی، اونچ ذات اور نیچ ذات کا تعصب نہیں ہو سکتا۔ وہ جغرافیہ یا نسل یا ذات پات کی بنیاد پر انسانوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔"

(آندھی میں چراغ ص ۹۹)

سیدین صاحب نے اقبال کے تصور انسانیت سے اپنی پسندیدگی کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

"اقبال کے تصور انسانیت کی نقاب کشائی کے لیے اس کے مندرجہ ذیل

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

شعروں پر غور کیجئے جو مجھے بہت محبوب ہیں اور جس میں اس نے بڑی سادگی اور صفائی سے آدمیت کا مطلب سمجھایا ہے۔ اس کے نزدیک آدمیت کی صرف ایک کسوٹی ہے، آدمی کی عزت کرنا، ہر آدمی کو بلا لحاظ نسل و ملت، کیونکہ اس میں نور الٰہی کا جلوہ ہے خواہ وہ کتنا ہی مدھم کیوں نہ ہو۔ جو عشق کا بندہ ہوتا ہے وہ خدا کے راستے پر چلتا ہے اور کفر و دین کا فرق بھلا کر کافر اور مومن کے لیے اپنے دل کے دروازے یکساں طور پر کھول دیتا ہے ؎

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہایش عشق و آغازش ادب
حرف بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت، احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی
بندہ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل
دل اگر بگریزد از دل وائے دل

کفر و دیں کے ضمن میں ایک دل چسپ نکتہ قابل ذکر ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "مومن" سے مراد ہے مسلمان اور کافر سے غیر مسلم۔ اس غلط فہمی میں غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بہت سے مسلمان بھی شریک ہیں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

جن کی خوش فہمی ان کی مذہبی بصیرت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اقبال نے اس بارے میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے اس کے نزدیک کافر اور مسلمان کا اصلی فرق رسمی عقائد کا نہیں بلکہ دل و دماغ کی ساخت کا ہے۔ زندگی کے بنیادی تصور اور آدرش کا ہے، ان سہاروں کا ہے جن کے بل بوتے وہ زندگی کو بنانا اور سنوارنا چاہتے ہیں۔ اقبال کی دنیا میں مسلمان کافر ہو سکتا ہے اور کافر مسلمان! فرق لیبل کا نہیں بلکہ اس شراب کا ہے جو ان کے ساغر دل میں چھلکتی ہے۔" (آندھی میں چراغ ص ۱۳۶)

سیدین صاحب کو مولانا ابوالکلام سے جس قدر تخصیص حاصل تھی اس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہاں ان کی اقبال سے جو تخصیص تھی اس کا پتہ ان خطوں سے چلتا ہے جو اقبال نے مختلف اوقات میں ان کے نام لکھے ہیں۔ آٹھ خطوط اقبال نامہ حصہ اوّل میں ص ۳۱۳ سے ص ۳۲۴ تک درج ہیں جن میں اقبال نے اپنے خانگی امور میں بھی سیدین صاحب سے مشورہ چاہا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف فلسفیانہ، تعلیمی اور سماجی امور کی طرف ان خطوں میں اشارے ملتے ہیں:۔

مختلف بانیانِ مذاہب کے افکار کا تقابلی مطالعہ | سیدین صاحب

نے مختلف مذاہب کے بانیوں کے افکار کا تقابلی مطالعہ کر کے ان سے ابدی قدروں کو اخذ کیا ہے۔ چنانچہ اپنی تحریروں میں جہاں کہیں وہ ابدی قدروں کا حوالہ دیتے ہیں تو ان کے سامنے گوتم بدھ، جناب عیسیٰ، پیغمبر اسلام، علی،

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

حسین اور گرونانک کے افکار و اعمال ہوتے ہیں ان کی معرکۃ الآرا کتاب آندھی میں چراغ کے پہلے حصّے کا عنوان ہے "ابدی قدریں"۔ ان ابدی قدروں کی تشریح انہوں نے مہاتما گاندھی، انسانِ کامل (پیغمبر اسلام)، امام حسینؑ اور گرونانک کے فکر و عمل کی روشنی میں کی ہے۔ خود لکھتے ہیں:۔

"کچھ مضامین میں ان ابدی قدروں کا ذکر ہے جن کی تفسیر ایسے مردانِ خدا کی زندگی اور تعلیم میں پائی جاتی ہے جن کے سرچشمۂ فیض سے عالمِ انسانیت نے اپنی روحانی پیاس بجھائی ہے" (ص ۲۹)

مہاتما گوتم بدھ کے پیغام کی تشریح کر کے آخری سطور میں فرماتے ہیں:۔

"یہ پیغام جو محبّت کا پیغام ہے، جو اہنسا کا پیغام ہے، جو شانتی کا پیغام ہے، جو فراخ دلی اور بے تعصبی کا پیغام ہے، جو انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا پیغام ہے، وہ پیغام جس کی بابت ایک مصنّف نے لکھا ہے کہ اس میں وہ اعتدال پسندی تھی جو یونانی تہذیب کا جوہر مانی جاتی ہے، وہ خاکساری تھی جس نے عیسیٰ کے مذہب کو سرفراز کیا اور وہ مساوات جو اسلام کا سرمایۂ ناز ہے کس قدر شدید ضرورت ہے آجکل کے زمانے میں اس پیغام کی"! (ص ۴۱)

پیغمبر اسلام کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک خاص نکتے کی طرف اس طرح نشان دہی کی ہے:۔

"ایک اور مخصوص پہلو اس رسول اکرم کی تعلیم کا یہ ہے .... کہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

انہوں نے دنیا کے سامنے مذہب کا ایک ارتقائی نظریہ پیش کیا۔ یعنی مختلف مذہب جو خدا کے بھیجے ہوئے نیک بندے مختلف زمانوں میں لائے وہ ایک دوسرے کے نقیض یا رقیب نہیں بلکہ ایک زریں سلسلے کی کڑیاں ہیں اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں خدا کا پیغام بر نہ آیا ہو کہ لوگوں کو بد اعمالیوں کے نتیجے سے خبردار کرے اور راہ راست پر چلنے کی ترغیب دے۔ ان سب کی تعلیم بنیادی اعتبار سے یکساں ہے۔ ان کے اصول مستقل اور ابدی ہیں۔ گو ان کی تفسیر اور تعبیر میں ان کی فروع (شاخوں) میں زمانے کے حالات اور ضرورتوں اور نفس انسانی کی تربیت اور ترقی کے مطابق تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اس لیے لازم آتا ہے کہ ہم سب مذہبوں کے بانیوں اور خدا کے پیغامبروں کا دل سے احترام کریں اور ان کی تعلیم کا ادب سے مطالعہ کریں۔ یہ دراصل ایک ایسا اصول ہے جو رواداری کو مصلحت پسندی سے بلند کر کے ایک قدر مستقل بنا دیتا ہے اور نام نہاد مذہبی لڑائیوں اور فسادوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔" (ص ۶۴)

پیغمبر اسلام کے عالمگیر تصورِ انسانی کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس تعلیم کا شاید سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے نسل، رنگ، دولت اور ذات پات کے جھوٹے امتیازوں کو دور کر کے اخوت اور مساوات کو اجتماعی زندگی کا بنیادی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اصول قرار دیا۔ اس کے اثر سے ایک حد تک مختلف نسلوں، قبیلوں اور مذہبوں کے لوگ جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے محبت و یگانگی کے ایک سلسلے میں گندھ گئے۔ ایک طرف اس نے خدا کی عظمت اور کبریائی کا نقش انسان کے دل پر بٹھایا دوسری طرف انسان کو اس کا صحیح مقام دکھایا جو نیابت الٰہی کا مقام ہے، جہاں انسان اپنی اخلاقی جد وجہد کے ذریعہ دنیا میں مشیت الٰہی کی تکمیل کرنے کا حوصلہ دکھاتا ہے۔ اس نے خیر و شر کا ایک عالمگیر تصوّر انسان کے سامنے پیش کیا جس نے جغرافی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے انسانوں کو شرافت اور امن دوستی کی بنیادی قدروں پر جمع کرنے کی کوشش کی کہ وہی اتحاد اور محبت کا راستہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے آخری باب میں اس سورت کی تعلیمی روح بیان کی ہے جو دراصل اسلام کی تعلیمی روح ہے اور پیغمبر اسلام کے عالمگیر تصوّر انسانیت کی تفسیر"

(ص ۶۷)

سیدین صاحب نے شہادت حسینؓ میں بھی ابدی قدروں کو تلاش کیا ہے اور ان کے کارنامے کو انسانی سیرت کی بلندی سے تعبیر کیا ہے:۔

"انہوں نے صرف عربوں اور مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کو جو حق اور باطل کی نہ ختم ہونیوالی جنگ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

میں شریک ہیں اور جن کو اپنا راستہ صاف طور پر نظر نہیں آتا یہ سبق پڑھایا کہ شرافت کے اصولوں پر قایم رہو خواہ اس کے لیے کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے ..... امام حسینؑ کی سیرت کے کون سے نقوش ہیں جو کربلا کے واقعات سے نمایاں ہوتے ہیں؟ حق پرستی اور جرأت اور استقلال، خدا کی رضاجوئی اور اس کے بندوں کے ساتھ شفقت، عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی، روزمرہ کی زندگی میں نرمی جو دلوں کو موہ لے اور اصول کی حمایت میں وہ ثابت قدمی جو کوہ کو کاہ بنا دے۔ یہ تھے حسینؑ جنھوں نے سرداری کو چھوڑ کر خدمت، عیش و آرام کو چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی جن کو خدا کے راستے کی موت شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی تھی جن کے دل میں عزیزوں، دوستوں، مسافروں، اجنبیوں، نوکروں بلکہ مخالفوں اور دشمنوں تک کے لیے جگہ تھی جو لین دین اور کاروبار میں عادل تھے۔ دوستوں کے مخلص تھے، دشمنوں کے ساتھ شجاعت اور انسانیت کا سلوک کرتے تھے، جو دوسروں کے لیے عفو اور احسان کا سرچشمہ تھا اور اپنے لیے سخت گیر روزمرہ کے معاملے میں ہر قسم کی رعایت کے لیے آمادہ اور اصول کے معاملے میں اٹل، جن کے دل میں خدا کا خوف اور انسانوں کی محبت۔ اس سے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

بڑھ کر انسانی سیرت کی بلندی کیا ہو سکتی ہے؟"

(ص ۷۷)

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیدین صاحب عقیدۃً شیعہ تھے۔ مگر وہ حکیمانہ تشیع کے علمبردار تھے اور حقیقت پسندی کے قائل، چنانچہ انہوں نے شہادت حسین کا تاریخی تجزیہ کر کے یزید کو مجرم گردانا ہے بعض انتہا پسند شیعوں کی طرح اس تاریخی جبر و ظلم کے ڈانڈے امیر معاویہ یا دیگر اصحاب و خلفائے رسول سے نہیں ملائے ہیں۔ حالانکہ اس موضوع پر بڑے سے بڑے ترقی پسند اور روشن خیال شیعہ کے فکر و قلم کو لغزش کا شکار ہو جانا پڑتا ہے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کا ایک شعر اور ایک بند ملاحظہ ہو وہ کربلا کا سلسلہ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کی مجلس شوریٰ سے ملاتے ہیں۔

(۱) برفتار صد لشکر اشقیا زداہ سقیفہ سوئے کربلا

(نظم مناجات۔ مجموعہ سرود و خروش ص ۱۸۸)

(۲) اہل دل سے کہہ رہی ہے یہ مورخ کی زباں
بعد پیغمبر ہوئی تھیں کس طرح سرگوشیاں
چھا گیا تھا ہر طرف کس طرح دولت کا دھواں
کیا دبے پاؤں چلے تھے سازشوں کے کارواں
اب بھی ان امواج میں ڈوبی پڑی ہے کربلا
ہاں انہیں کی ایک تاریخی کڑی ہے کربلا

اسی طرح شیعوں میں عقیدۂ توحید کے بعد دوسرا عقیدہ عدل کا ہے۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیدین صاحب نے اس کا تعارف کس خوبصورتی سے کرایا ہے :۔

"دوسرا عقیدہ عقیدۂ عدل ہے۔ یعنی خدا ظالم نہیں بلکہ صاحب انصاف ہے اور جس طرح اس کے ہاں ہر معاملہ میں انصاف کی کارفرمائی ہے (خواہ ظاہر میں نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں) اس طرح انسانی رشتوں اور تعلقات میں انصاف برتنا انسان کا شرف ہے۔ اسلام نے حسن، خیر اور حق کی قدروں کے ساتھ جو قدیم یونانی تہذیب کا امتیاز ہیں، عدل کو بھی ایک بلند مقام بخشا ہے۔" (آندھی میں چراغ ص ۶۵)

اسی طرح عقیدۂ رسالت کی ضمن میں عقیدۂ امامت کو نہایت سنجیدگی اور متانت سے پیش کیا ہے جو کسی بھی نقطۂ نظر کے قاری پر گراں نہیں گزرتا:۔

"مسلمانوں کے آخری نبی محمد عربیؐ ہیں جن کے پیام اور کلام کو ان کے بعد اماموں اور خدا کے نیک بندوں نے دنیا میں قائم رکھا اور پھیلایا ہے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں۔" (ص ۶۵)

اسی طرح گرونانک کا تصور انسانیت پیش کرتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں :۔

"اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گرونانک کی نظر اس ابدی اور بنیادی حقیقت تک پہنچ گئی تھی جو مختلف مذہبوں میں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

الگ الگ روپ اختیار کر لیتی ہے لیکن باوجود اس ظاہری فرق کے باطن میں ایک ہی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے ہمدردی اور محبت کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ اپنی زندگی میں اس کی اعلیٰ ترین مثال دکھائی۔ اسلام نے سکھایا کہ "تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے" اس لیے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور شرافت کا سلوک کرنا چاہیے جیسا وہ اپنے قریبی عزیزوں سے کرتے ہیں، رنگ ونسل اور ذات پات کے امتیاز بالکل جھوٹے اور مصنوعی ہیں"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"گرونانک کے شبد پڑھتا ہوں تو ان میں اسی سچی مذہبیت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور محبت، رحم، ہمدردی، خدمت اور زندگی کی سچی قدروں کا وہ پیغام ملتا ہے جس کے لیے آج دنیا بھوکی اور پیاسی ہے..... انسان کو انسان بننے کے لیے بھٹی میں تپنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی سیرت کا سونا، جس میں بہت سا کھوٹ ملا ہے، کندن بن سکے۔ اسے اپنے دل ودماغ کی کھڑکیوں کو کھولنا ہے اور ان میں سے ہنسا اور نفرت کو خارج کر کے محبت اور شرافت کو جگہ دینی ہے۔ یہی وہ پیغام ہے جس کو مختلف الفاظ اور انداز میں ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ اور موسیٰؑ اور مہاتما بدھ اور حضرت محمدؐ اور گورو نانک اور خدا کے بہت سے نیک اور پاک بندوں نے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پیش کیا ہے۔" (ص ۸۴)

سیدین صاحب دل و دماغ کی گہرائیوں سے مسلمان تھے اور باوجود اس کے نہیں بلکہ اسی وجہ سے وہ بار بار انسانوں کی مشترک قدروں پر ان کے اٹوٹ رشتوں پر، ان کی فطری اخوت اور محبت پر زور دیتے تھے ان کی نظر میں سچی انسانیت اور سچے اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ لوگ اپنے دلوں اور دماغوں کو تنگ نظری کی لعنت سے پاک کریں اور سب انسانوں کے لیے محبت کے جذبے کو بیدار کریں اور اسی کی روشنی میں زندگی کے کٹھن راستے کو پار کریں۔ یہی مغالطہ سیدین صاحب کے نزدیک اقبال کا بھی تھا۔ اقبال کو لوگوں نے عالمگیر تصور انسانیت اور قومی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس موضوع پر مسٹر جگن ناتھ آزاد نے کھل کر لکھا ہے ملاحظہ ہو ان کی کتاب "اقبال اور اس کا عہد" سیدین صاحب اور اقبال کے مابین فکری ربط کی بنا پر جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب کا انتساب سیدین صاحب سے یہ رباعی لکھ کر کیا ہے ؎

لائق نبود قطرہ بہ عمان بردن — خار و خس صحرا بہ گلستان بردن
لیکن چہ کنم کہ رسم سودے باشد — پائے ملخے پیش سلیمان بردن

سیدین صاحب دل و دماغ کی گہرائیوں تک ہی نہیں بلکہ عمل کی منزلوں میں بھی مخلص مسلمان تھے۔ نماز کے سن شعور میں آخر دم تک اور روزے کے اس وقت تک پابند رہے جب تک وہ علالت سے معذور نہ ہو گئے۔ صوم و صلات کا معمول انہوں نے انگلستان میں طالب علمی کے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

زمانے میں بھی نہیں چھوڑا۔ قرآن کی تلاوت ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ اکثر کرتے تھے۔ فن تجوید انہوں نے پانی پت کے مشہور قاری مولوی محی الاسلام سے سیکھا تھا اور ان کی قرأت بڑی شیریں اور دل آویز تھی۔

(منقول از ڈاکٹر عابد حسین)

گاندھی جی سے عقیدت

سیدین صاحب گاندھی جی کی سحر آفریں شخصیت سے بیحد متاثر تھے۔ ان کے فکر و عمل کی روح کی تشریح کرتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں:۔

"گاندھی جی نے مغربی تہذیب کے ان تمام اثرات کے خلاف اپنی ذاتی مثال تعلیم اور مختلف عملی تحریکوں کے ذریعہ جہاد کیا جنہوں نے ہندستانی سیرت کو کمزور اور ہندستانیوں کی قوت عمل کو شل کر دیا تھا انہوں نے لوگوں کو سبق دیا عیش پرستی کی بجائے سادگی، لالچ کی بجائے قناعت کا، خوشامد کی بجائے خودداری کا، جھوٹ کی عافیت کی بجائے سچ کے خطروں کو نوازنے کا، بزدلی کی بجائے ان کی خدمت کا، انہوں نے اس بات پر زور دیا محض ضرورتوں کو بڑھانا اور ان کی تشفی کے لئے مادی پیداوار میں اضافہ کرنا تہذیب کی ترقی کا ثبوت نہیں۔ اس کا تعلق بڑی حد تک نفس انسانی کی باطنی دولت سے ہے یعنی ان کی ہمہ گیر تحریک کا مرکزی مقصد قوم کی اسپرٹ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا تھا تاکہ وہ آزادی کی ہمت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

طلب اور صبر آزما فضا میں سانس لینا سیکھیں مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قومی سیرت کی یہ کمزوریاں ہم میں صرف مغرب کے اثر سے پیدا نہیں ہوئی تھیں بلکہ دو سو برس کی غلامی، سیاسی، ابتری اور جاگیر دارانہ نظام کا نتیجہ بھی تھیں۔ اس لیے ان کی ذمہ داری مغرب سے زیادہ خود ہم پر عائد ہوتی ہے۔ گاندھی جی اس بات کو خوب سمجھتے تھے اور انہوں نے اپنی بے باک تنقید کے ساتھ ساتھ اپنی حق پسندی کی وجہ سے مغرب کی خوبیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا اور ان سے سبق لینے کی بات کی۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس تہذیب کے بعض مشینی لوازمات کا سواگت نہیں کیا، نہ اس کی مذہب سے بے تعلقی، تکلف پسندی اور عیش و عشرت کی ذہنیت کو قبول کیا۔ انہوں نے سرمایہ دارانہ کش مکش اور چھین جھپٹ کے خلاف فرد سختی سے آواز اٹھائی لیکن مغربی قوموں کی سخت اور علمی جد و جہد کو ان کی زبان اور ادب کو ان کی سائنس اور فلسفے کی روح کو ان کی جمہوری تحریکوں کو ان کے لبرل اور سوشلسٹ تجربوں کو جن کا مقصد عوام کی زندگی کو بہتر بنانا تھا ان سب کو انہوں نے سراہا۔ اور ان سے اپنے کام میں مدد لی۔"

(ص ۳۳۳)

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

جواہر لال نہرو سے محبت

سیدین صاحب جواہر لال نہرو کے فکر و عمل سے کس قدر متاثر تھے اس کا اندازہ جابجا ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ انہوں نے نہرو کے سلسلے میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں جن پر کم ہی نظر جاتی ہے ہندستان کی موجودہ زندگی میں مختلف عناصر کی کشمکش پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے نہرو کے فکر و عمل کی شاہراہوں کا تعین بڑے ہی دلچسپ اور واضح انداز میں کیا ہے:۔

"جواہر لال میں ہر مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور ان کے مطالبات میں توازن قائم کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے ایک عملی آدمی کے لیے جس کو حکومت چلانی ہے یہ چیز کسی حد تک کمزوری کا باعث ہو لیکن ایک مفکر کے لیے جس کو قومی مقاصد اور پالیسی کا تعین کرنا ہو، یہ بہت اہم صفت ہے۔ چنانچہ جس طرح انہوں نے سائنس اور روحانیت میں تضاد کی بجائے ہم آہنگی کی تلاش کی ہے اسی طرح انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے کی تفسیر کی ہے۔ یہ ایک نظری بحث نہیں بلکہ ہمارے مستقبل کے لیے ایک نہایت مشکل اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس وقت ملک میں بعض گروہ ہیں جو ماضی کے تمام کارناموں کو مسترد یا نظر انداز کر کے ایک ایسے مستقبل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں جس کا ماضی کے ساتھ کوئی خاص رشتہ نہ ہو۔ بعض گروہ ایسے ہیں جو مستقبل کی طرف

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پشت کر کے شخص ماضی کی پوجا کرنا چاہتے ہیں اور اس پوجا میں اس کے حیات آفریں عناصر میں بھی تمیز نہیں کر پاتے پھر ماضی کے ان پرستاروں میں بعض ایسے ہیں جن کے نزدیک "ماضی" صرف قدیم زمانے تک محدود ہے اور اس کے بعد جو دور آئے وہ سب نقصان کا سودا تھے۔ یہ مختلف عناصر ملک کو مختلف سمتوں میں کھینچ رہے ہیں اور لوگوں کی ذہنیت کو اپنے اپنے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ جواہر لال نہرو، ٹیگور، آزاد، سروجنی نائیڈو، رادھا کرشنن جیسے لوگوں کا ایک احسان یہ ہے کہ اس رسہ کشی میں انہوں نے عقل اور رواداری کے تقاضوں کا احترام کیا ہے اور ماضی اور مستقبل کے صحیح رشتہ کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔ جواہر لال کا رخ مستقبل کی طرف ہے لیکن وہ ماضی کی بہترین قدروں اور کارناموں کو دامن میں سمیٹ کر ان سے قوت حاصل کر کے اس طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ خذ ما صفا دع ما کدر (اچھی چیزوں کو لو اور بری چیزوں کو چھوڑ دو) کے اصول کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تہذیب کی مثال ایک درخت کی سی ہے جس کی جڑیں اپنی سرزمین میں پیوست ہونی چاہئیں تاکہ اس میں قوت اور استقلال پیدا ہو۔ لیکن اس پر چاروں طرف سے دھوپ اور روشنی پڑنی چاہیے اور ہواؤں کے آنے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کے لیے دروازے کھلے ہونے چاہئیں تاکہ اس میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہو اور نئے پھول پتے نکلیں۔ جب کسی تہذیب میں تعصب اور تنگ نظری راہ پا جاتی ہے، جب چھوٹے چھوٹے اختلاف مخالفت کا سبب بن جاتے ہیں، جب ذات پات کا بھید بھاؤ اور زبانوں، صوبوں اور عقیدوں کے فرق، ذہنی توازن کو بگاڑ دیتے ہیں، جب اس زہریلی فضا میں افراد اور جماعت کی زندگی جنبہ داری انصاف کی جگہ لے لیتی ہے اس وقت مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے بلکہ خدا بھی حافظ نہیں کیونکہ اس کے بتائے اور سکھائے ہوئے شرافت کے اصولوں کو توڑ کر کوئی قوم قوانین قدرت کے مطابق فلاح کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ یہی وہ خوفناک تحریکیں ہیں جو قومی زندگی کی فضا پر سانپوں کی طرح منڈلا رہی ہیں اور جن کے خلاف جواہر لال نہرو نے ہمیشہ بے خوفی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ ان کے خیالات بہت سے بااثر حلقوں میں سخت نامقبول ہیں دوسرے بہت سے اہل فکر کے برخلاف، جو محض اپنے خیال کے اظہار پر بس کرتے ہیں، ان کے خیال اور عمل میں ایک خاص یک جہتی ہے۔ وہ جو سوچتے ہیں اسے کرنا بھی چاہتے ہیں۔ فکر و عمل کے اس امتزاج نے ایک طرف ان کی زندگی کو کہیں زیادہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کٹھن بنا دیا ہے اور دوسری طرف ان کو خوشی اور اطمینان کا
ایک ایسا سرچشمہ بخشا ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔"
(آندھی میں چراغ ص ۲۴۹)

نہرو کی تقاریر کے اکثر مضامین سیدین صاحب کے حافظے کی قندیل میں روشن رہتے تھے۔

ذاکر صاحب سے قلبی رابطہ

سیدین صاحب کو ذاکر صاحب سے قلبی رابطہ تھا۔ اگر ان دونوں حضرات کے لیے "یک جان دو قالب" کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام و اعتراف کرتے تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں "نظام اردو خطبات" کے سلسلے میں ہندستان کے شہرۂ آفاق پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ذاکر صاحب کو مدعو کیا تھا۔ ان خطبات کا آغاز سیدین صاحب کے لکچروں سے ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی ذاکر صاحب کو سمپوزیم کے موقع پر فاروقی صاحب نے مدعو کیا تھا مگر وہ نہ آسکے تھے۔ اس بار ذاکر صاحب یہ کہتے ہوئے تشریف لے آئے۔

"سمپوزیم کے موقع پر فاروقی صاحب کو مایوس کر چکا تھا اس مرتبہ اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ ان کا اصرار تھا اور سیدین صاحب کا لیکچر تھا، کیسے نہ آتا، حاضر ہوں۔"

(افتتاحیہ از ذاکر صاحب)

اس افتتاحیہ کے آخر میں ذاکر صاحب نے فرمایا:۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

"مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ ان خطبوں کا آغاز میرے عزیز دوست اور کرم فرما پروفیسر خواجہ غلام السیدین کے لیکچروں سے ہوگا جو ایک دیدہ ور ماہر تعلیم، خوش بیان مقرر اور اردو کے نہایت دل نواز ادیب ہیں"

سیدین صاحب ذاکر صاحب کو "مردِ مومن" سمجھتے تھے اور اقبال کے اس شعر کا مصداق ؎

تجھ سے ہوا آشکارا بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

ذاکر صاحب کی شخصیت میں جو چیز سب سے زیادہ ان کے لیے وجہِ کشش بنی اس کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

"ذاکر صاحب کی عظمت بہ حیثیت ایک معلّم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ ان کو موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انہوں نے ایک بہت مشہور درس گاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی حامل ہے اور عصرِ حاضر کے شیطانی ہیجان میں انہوں نے اپنے مذاق سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم اور عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ وقیع ہے! ؎

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست!
مشہور گشت ازاں کہ بہ آتش نکو نشست

آگے چل کر سیدین صاحب نے ذاکر صاحب کے نظریۂ قومیت کی تشریح حقیقت پسندانہ اور دل کش انداز میں کی ہے :-

"ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ ہندستان کی مختلف جماعتیں اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک منظم، روادار اور فراخدل قومیت کی بنیاد ڈالیں اور اپنے اپنے مخصوص تمدنی ورثے اور صلاحیتوں سے ہندستانی تہذیب و تمدن کو فروغ بخشیں۔ اسی لیے انہوں نے جامعہ میں بیک وقت قومیت اور اسلامیت کی قدروں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ بے شک غلط قومیت اور اسلام، ایک دوسرے کے نقیض ہیں لیکن سچی قومیت میں، جو وطن کی محبت اور اس کی خدمت کو جزو ایمان سمجھتی ہے..... (حب الوطن من الایمان) اور مذہب کی حقیقی روح میں کوئی بنیادی تناقض نہیں ہے۔ انہوں نے عمل سے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جو شخص واقعتاً ایک اچھا مسلمان ہوگا اس میں یقیناً وہ صفات ہونی چاہئیں جو ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہیں۔ وہ نہ غلط اور تنگ نظر قومیت کے لیے اپنے مذہب کا سودا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کرے گا نہ مذہب کو اپنی تنگ نظری اور ناروا داری کی آڑ بنا کر تاریخی ارتقا کے سلسلے میں حارج ہوگا۔ لیکن جہاں وہ ایک طرف اس بات کے مخالف ہیں کہ مسلمان خود کو قومی زندگی کے دھارے سے علیحدہ کرلیں، وہاں وہ سختی اور خلوص کے ساتھ اس اندھی تحریک پر بھی احتساب اور تنقید کرتے ہیں جو ہندستان کی زندگی اور تہذیب میں سے ان قابل قدر عناصر کو نکال دینا چاہتی ہے جو مسلمانوں نے گذشتہ ہزار برس میں ہندستان کو بخشے ہیں"

(ص ۲۷۷ ـ ۲۷۸)

آدمی سے انسان

سیدین صاحب نے اس موضوع پر اپنی کتاب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اہل نظر کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ تاریخ انسانی کے مختلف ادوار سے انہوں نے کچھ نتائج اخذ کئے ہیں اور انہیں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔

غالب کے اس شعر ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

پر تنقید کرتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں :۔

"غالب کا دعویٰ صحیح لیکن دلیل کمزور ہے۔ (خیال) تو یہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام کام بھی آسان ہوتے جب بھی آدمی کا انسان بننا مشکل تھا کیوں کہ یہ تو کائنات کا سب

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سے کٹھن تخلیقی کاروبار ہے۔" (ص ۳۱۶)

شیخ سعدی کے مشہور قطعہ ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس پر سید ین صاحب اس طرح تنقید کرتے ہیں :-

"شیخ سعدی نے کہا ہے کہ ابر اور ہوا، چاند اور سورج سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں تاکہ آدمی اپنی روزی کمائے اور اس کو غفلت کے انداز میں نہیں بلکہ سمجھداری اور شرافت کے ساتھ کھائے (اور کھلائے) یہ سب انسان کی خاطر فضائے آسمانی میں سرگرداں ہیں اور فرمان الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ سب اپنا اپنا فرض ادا کریں اور آدمی اپنے فرض کی طرف سے غافل رہے لیکن شاعر نے اس نکتے کو واضح نہیں کیا کہ اجرام فلکی اور ابر اور ہوا کا معاملہ آسان ہے کیوں کہ وہ قدرتی قانون کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں ان کی حرکت میں کوئی پیچیدگی یا گمراہی اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتی کہ ان کو قوت ارادی یا عمل کی آزادی نہیں دی گئی۔ انسان کا معاملہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اس سے مختلف ہے۔" (ص ۳۱۷)

آدمی کے انسان بننے کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے ان کی نشاندہی سیدین صاحب نے اس طرح کی ہے :-

" علاوہ رواداری اور انسان دوستی کے دو اہم صفات اور ہیں جن کے بغیر ایک صالح اور کامیاب زندگی کی بنیاد مستحکم نہیں ہو سکتی۔ ایک تو جرأت جس کے بغیر آدمی دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ ایک بزدل آدمی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے دنیا کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے اور اپنا راستہ چھوڑ کر دوسروں کے راستے پر چلے کہ اسی میں امن اور عافیت ہے۔ اس میں ایک عنصر جسمانی جرأت کا ہے جس کے بل پر وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی تکلیفیں اور خطرے جھیلنے کو تیار ہو جاتا ہے اور دوسرا ذہنی جرأت کا جو تنقید اور اجتہاد کا سرچشمہ ہے، جو رائے کے معاملے میں بھیڑ چال کو جائز نہیں سمجھتی اور عقیدے کے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر آزادی فکر و عمل کے خطروں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اسی کا ایک پہلو اخلاقی جرأت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کے سہارے انسان اپنے ضمیر کی آواز پر چلتا ہے۔ اور جب اس میں اور سماج کے مطالبوں میں صریح اختلاف ہو، سماج کی مخالفت کی پروا نہیں کرتا..... تیسری صفت جو دل کی گرمی اور نرمی اور جرأت کے ساتھ مل کر انسانی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیرت کی تکمیل کرتی ہے ذہنی بیداری ہے جس کی شمع ہاتھ میں لے کر ہم اپنی پیچیدہ زندگی کی بھول بھلیوں میں سیدھا راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔" (ص ۳۲۴)

اس مضمون کو سیدین صاحب نے مندرجہ ذیل سطور پر ختم کیا ہے:-

"اگر کسی آدمی میں بقدر توفیق یہ تین صفتیں جمع ہو جائیں تو وہ انسان بن جاتا ہے یا بن سکتا ہے ایسا انسان جو بڑی حد تک تعصب اور تنگ دلی، جہالت اور وہم پرستی، بے انصافی اور حق تلفی سے پاک ہو اور انسان دوستی، حق پسندی، فراخدلی، رواداری اور محنت اس کا شیوہ ہو۔ اس انسان کے لیے نہ قارون کی دولت درکار ہے نہ افلاطون کا علم، نہ یوسف کا حسن، نہ سکندر کی حکومت، اس کا سرمایۂ حیات (اقبال کے نکتہ رس الفاظ میں) محض ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستی شوق ہوگا اور بس! (ص ۳۲۴)

ہندستان کا مستقبل

سیدین صاحب ہندستان کے مستقبل سے مایوس نہ تھے۔ وہ ایک مناسب حد تک رجائیت کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک باوجود ان تمام مشکلوں اور خرابیوں کے، ان اختلافات اور تنگ نظری کے مظاہروں کے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے پر چھائے ہوئے ہیں ہمارے قومی تمدن میں ایسی قوتیں کارفرما ہیں اور ہمارے ہاں ایسے وسائل اور ذرائع موجود ہیں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

جو اس کے مستقبل کو روشن بنانے کے لیے کافی ہیں۔

ان میں سے ایک قابل ذکر چیز ہمارے تمدن کا تسلسل اور اس کے زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ سیدین صاحب لکھتے ہیں :-

"اگر ہم اس کے تاریخی پس منظر پر سرسری نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تہذیب ہزاروں برس کی کوشش اور بہت سے فکری دھاروں کے میل کا نتیجہ ہے۔ وہ گویا ایک سمندر ہے جس کی گود میں بہت سے دریاؤں اور ندیوں نے دور دور سے آکر اپنے خزانے ڈال دئے ہیں۔ یونان اور مصر اور روم کی تہذیبیں بنیں اور بگڑ گئیں لیکن ہندی تہذیب کا سلسلہ ہزاروں برس سے اسی طرح قائم ہے بلکہ اس کے تخمیر میں نئے عناصر کے مل جانے سے زیادہ قوت اور شگفتگی پیدا ہوتی رہی ہے۔ یہ تہذیب اگر کسی چیز پر بجا طور پر ناز کر سکتی ہے تو وہ اس کی فراخدلی، مختلف اثروں کو قبول کرنے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے"۔

(ص ۳۲۶)

ہندو مسلم اثرات سے جس ہندستانی تہذیب کی تشکیل ہوئی اس کا بیان سیدین صاحب نے اس طرح کیا ہے :-

"اس طرح ہندو مسلم اثرات کے سنگم سے ایک نئی ہندستانی تہذیب پیدا ہوئی جس نے مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور قوموں کے خزانے سے بہت سی اچھی چیزیں لیں اور ان کو ایک دوسرے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کے ساتھ سموہ کردہ حسین ہم آہنگی آراستہ کی جو کہیں تاج محل اور موتی مسجد کی شکل میں چمکتی ہے کہیں تان سین کی موسیقی اور مغل مصوری میں جھلکتی ہے، کہیں کبیر اور نانک کی بھگتی اور چشتی کے تصوف میں ظاہر ہوتی ہے، کہیں حالی اور نظیر اکبر آبادی اور اقبال کی شاعری اور سرشار اور پریم چند اور آزاد کی نثر بن کر دل کے تار ہلاتی ہے اور کہیں اکبر اعظم کی گنگا جمنی تہذیب کا روپ اختیار کرتی ہے اور (اگر ہم دور حاضر کی حدود میں داخل ہوں تو) اس کا جلوہ گاندھی کی انسان دوستی اور جواہر لال کی بین الاقوامی سیاسی پالیسی کی صورت میں اجاگر ہوتا ہے"۔

(ص ۳۲۷)

آگے چل کر اس سلسلے میں سید بن صاحب نے بڑی جرأت کے ساتھ بعض رجعت پسند افراد کو للکارا ہے:۔

"اس پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ بعض لوگ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں اور حرکتیں کرتے ہیں جیسے ہندستانی تہذیب کسی خاص مذہب یا جماعت یا ذات یا قوم یا نسل یا زمانے کی ملکیت ہو جس میں بعض غیر ملکی اجزا زبردستی شامل ہو گئے ہوں اور اس کی عفت کو قائم رکھنے کے لئے ان کو خارج کرنا ضروری ہے! ہر انصاف پسند اور معقول شخص کا فرض ہے کہ وہ مضبوطی کے ساتھ اس رجعت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پسندانہ نظریے کو مسترد کرے۔ قومی تہذیب پر عمل جراحی ناممکن ہے۔ جیب انسان کے خون میں سے اس کے مختلف اجزا کو علیحدہ کر سکیں جب آپ کسی نغمے میں سے اس کے زیر و بم کو جدا کر سکیں، کسی خوبصورت ریشم کے ٹکڑے میں سے تانا اور بانا الگ کر دکھائیں قومی ادب کی شیرینی میں سے مختلف زبانوں اور گروہوں کا حصہ الگ الگ نکال کر رکھ دیں اور اس کے بعد بھی خون خون رہے، نغمہ نغمہ رہے، ریشم ریشم رہے، ادب ادب رہے۔ اس وقت آپ قومی تہذیب کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کریں اور اس کو پاک اور پوتر بنانے کا خواب دیکھیں"۔ (ص ۳۲۷)

ہندستان کی موجودہ کمزوریوں کی طرف نشاندہی کر کے سیدین صاحب نے مستقبل سے مایوسی ظاہر نہیں کی ہے:-

وہ کہتے ہیں:-

"لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود میں ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ ہماری قوم میں بہت سی شرافت کی چنگاریاں ہیں جو ابھی تک راکھ کے اندر پوشیدہ ہیں، بہت سی بجلیاں ہیں، جو بادلوں میں آسودہ ہیں"

(ص ۳۵۰)

سیدین صاحب کا کہنا ہے کہ ہم ہندستان میں ایسا سماج قائم کر سکیں گے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(مستقبل میں) جس کا خواب مختلف شکلوں میں مہاتما بدھ سے لے کر حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور افلاطون سے لے کر کارل مارکس تک بے شمار انسانوں نے یہ قدر نظر دیکھا ہے۔ وہ ہندستان کے مستقبل سے ہرگز مایوس نہ تھے۔ ان کے عقیدے کی ترجمانی اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے اور وہ اس انقلاب کے لئے چشم براہ تھے جس کی اقبال نے پیشین گوئی کی ہے ؎

من درین خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بہ آغوش زمین است ہنوز
شاخ و شاخ تنومند و جواں می بینم
کوہ را مثل پر کاہ سبک می یابم
انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ نہ دانم کہ چساں می بینم

قوموں کی تقدیر

سیدین صاحب کے نزدیک قومی ترقی کیلئے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ قومی زندگی کی بنیاد سماجی انصاف کے اصولوں پر رکھی جائے۔ اس بنیادی صفت کے بغیر اور تمام کمالات بیکار ہیں یا بیکار ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس سماج میں انصاف نہیں ہوتا وہاں تلوار اور قلم ادب اور آرٹ دولت اور تجارت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

قوت اور حکومت سب کو کوئی چیز اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک روز یہ ساری عمارت نیچے آپڑتی ہے۔ ان کے خیال میں قومی ترقی کے لئے دوسری اہم شرط محنت، جفاکشی اور کسب حلال کی عادت ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ جب انصاف، محنت، سادگی اور کفایت شعاری کی بنیادوں پر قومی زندگی کی عمارت کھڑی ہو جائے تو اس میں قوت، حسن و خوبی اور نظم و ترتیب پیدا کرنے کے لیے افراد و قوم میں تین صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرأت، رواداری اور ڈسپلن۔

سیرین صاحب کے نزدیک اقبال کے اس شعر ؎

یہ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

میں "شمشیر و سناں" میں خوں ریزی کی تلمیح نہیں، جفاکشی، محنت کوشی اور خدمت خلق کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے ان کے استعمال پر ایک بہت کڑی شرط عائد کی گئی ہے ؎

ہر کہ شمشیر بغیر از پئے حق کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

یعنی اگر حق اور ملک و قوم کی ہوس میں تلوار اٹھائی جائے تو وہ تلوار خود تلوار اٹھانے والے کے سینے میں اتر جائے گی۔

تہذیب کی حفاظت

سیرین صاحب کے نزدیک تہذیب کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری اہل قوت و سیاست

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پر نہیں یہ لوگ زیادہ سے زیادہ انسانی ضمیر میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے ایک سازگار ماحول مہیا کر سکتے ہیں۔ سیدین صاحب کا خیال ہے کہ یہ ذمہ داری عالموں، ادیبوں، معلموں اور دوسرے اہل فکر کی ہے۔ حیات برتر کے لیے اس جدوجہد میں ہمارے پاس علاوہ اپنی تہذیبی میراث کے ایک سرچشمۂ ہدایت اور بھی ہے اور وہ ہے گاندھی جی کی تعلیم اور ان کا کام۔

سیدین صاحب کا خیال ہے کہ انسانوں کی باہمی مخالفتوں میں سب سے زیادہ ناپاک مذہبی مخالفت اور ناروا داری ہے۔ کسی شخص یا جماعت کے خلاف اس بنا پر تعصب کرنا یا اس کی حق تلفی کرنا کہ اس کا تصور کائنات یا طریقۂ عبادت ہم سے مختلف ہے۔ انتہائی حماقت ہے۔

سائنس اور تحقیق حق

سیدین صاحب کے نزدیک سائنس کے مشاہیر بھی دنیا کے معلمین اخلاق و بانیان مذاہب کی طرح عقیدت و احترام کے مستحق ہیں جو ہمیشہ اپنے عقیدت میں ثابت قدم رہے اور ذہن انسانی کی ترقی کے ذمہ دار۔ سیدین صاحب مختلف سائنس دانوں کے حالات، واقعات اور نظریات و افکار سے پوری طرح باخبر تھے وہ اپنی تقریر و تحریر میں سائنس دانوں کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ میرے خیال میں ان کو سائنسی نقطۂ نظر مشاہیر سائنس (GIANTS OF SCIECE) سے گہری دلچسپی اور واقفیت ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل کو انہیں سائنس دانوں کے کاندھوں پر چڑھ کر دیکھا تھا ـــــ بقول

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اسحاق نیوٹن۔

"If I have seen further it is
by standing on the shoulders of
giants."

آئن اسٹائن سے تو انہیں والہانہ عشق تھا۔ وہ اکثر گفتگو اور تحریر کے دوران میں آئن اسٹائن کا یہ قول دہرایا کرتے تھے:۔

"دنیا میں سب سے بڑی اور ناقابل تسخیر قوت ارادے کی مضبوطی اور اخلاقی توانائی ہے"

وہ آئن اسٹائن کو اس عالم کا روشن منارا سمجھتے تھے۔ سیدین صاحب کو آئن اسٹائن کی زندگی کا یہ پہلو سب سے زیادہ متاثر کرتا تھا کہ اگرچہ وہ ایٹم بم کی تیاری میں سب سے زیادہ حصہ لیتا رہا مگر وہ ایٹمی ہتھیاروں کی پیداوار اور اس کے تباہ کن اثرات سے آخر وقت تک نفرت دلاتا رہا۔

وہ سائنس دانوں کے اعلان حق کی داستان کو مذہبی رہنماؤں کی حق پرستی کے ساتھ ملا کر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"پھر یورپ نے صدیوں بعد تحقیق سائنس کے میدان میں مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمائے اور اس کے ذریعہ رفتہ رفتہ ساری دنیائے جدید پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں عین اسی زمانے میں جب ظلمت پرستی کا دور دورہ تھا علم کو خطرناک یا بیکار سمجھ کر رد کر دیا جاتا تھا اور ذہن کی آنکھوں پر اندھیریاں چڑھی تھیں، اسکولوں، یونیورسٹیوں،

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

3735

خانقاہوں اور حق پرستی کے دوسرے غیر معروف لیکن روشن گوشوں میں ایسے بندگانِ خدا موجود تھے جنہوں نے اپنے آپ کو علم و حکمت کی خدمت اور تحقیقِ حق کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان ہی بندگانِ الٰہی کی بدولت عقل و دانش کا جھنڈا برابر کہیں نہ کہیں لہراتا رہا ان کے ہم عصر عام طور پر توہمات اور بے معنی لڑائیوں یا ملک گیری کی ہوس میں الجھے ہوئے تھے یا دولت جمع کرنے اور طفلانہ بھولے پن میں مگن تھے، مگر ان کا کام یہ تھا کہ جہل و تعصب سے جنگ کرتے رہیں اور اپنے ذہنوں کو کہ خدا کی دین تھے ہر حال میں روشن اور بیدار رکھیں۔"

"ان پر اس جرم کی پاداش کہ وہ نامقبول خیالات اور عقائد کے اظہار کی جسارت کرتے تھے اور حق کا اعلان، طرح طرح سے ظلم توڑا گیا مگر ان کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ سقراط، حضرت مسیح، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، امام حسین اور ابراہیم لنکن، مہاتما گاندھی اور بہت سے دوسرے مصلحوں، مفکروں اور سائنس دانوں کے نام ان حق پرستوں کے زمرے میں شامل ہیں جو ہمیشہ اپنے عقیدے میں ثابت قدم رہے اور ذہن انسانی کی آزادی کے علمبردار۔ گلیلیو کو تعذیب کی دھمکیوں سے مجبور ہو کر کوپرنیکس کے نظریے کی حمایت سے دست بردار ہونا پڑا مگر اس وقت بھی جب وہ معذرت نامے پر دستخط کر رہا تھا، چپکے چپکے یہ کہتا جاتا تھا۔ "بہرحال زمین گردش کرتی ہے۔" مشہور ڈومنکن پادری گیارڈانو برونو کو علم جدید سے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

دلچسپی رکھنے کی بنا پر کلیسا کے محکمۂ احتساب کے حکم سے ملحد قرار دے کر جلا دیا گیا۔ دراصل تاریخ عالم کے عظیم ترین شہید وہی تھے جو علم یا اخلاق کے میدان میں بے خوف و خطر حق پر شہادت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہیں اس راہ میں آخری قربانی دینی پڑی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غرض یہ جانتے ہوئے بھی کہ فکر کی روشنی ہر طرف سے طوفانوں میں گھری ہوئی ہے اور اس کا راستہ پل صراط کی طرح خطرناک ہے، ہم اپنے دل کو اس خیال سے ڈھارس دلا سکتے ہیں کہ یہ شمع کبھی بجھ نہیں سکتی۔ انسان کے جسم کو ہلاک کر دینا آسان ہے مگر اس کے ذہن کو ہلاک کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اپنے کارناموں میں زندہ رہتا ہے اور اس طرح گویا ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔" (فکر انسانی کا سفر ارتقاص ۷، ۵۸)

فکر کی روشنی کی تشریح کرتے ہوئے سپین صاحب برٹرینڈ رسل کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں جس نے انسانی زندگی میں فکر کی کارفرمائی کا ذکر اس کی آزمائشوں اور مصیبتوں کا بھی اور اس کی قوت و عظمت کا بھی بڑی خوبی اور بڑے پر شوکت الفاظ میں کیا ہے۔ رسل کہتا ہے:

"فکر سے لوگ جتنا ڈرتے ہیں، دنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈرتے نہ تباہی سے نہ موت سے۔ فکر ایک ہنگامہ خیز، انقلاب انگیز قوت ہے۔ بڑی تباہ کن، بڑی خطرناک۔ فکر بڑا بیدرد دشمن ہے، مخصوص حقوق کا، مستقل اداروں کا، تن آسانی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کی عادتوں کا۔ فکر نراجی ہے۔ لاقانونی ہے۔ نہ اقتدار و حکومت کو خاطر میں لاتا ہے نہ صدیوں کی آزمودہ حکمت کی پروا کرتا ہے۔ فکر تعزیر دوزخ میں جھانکتا ہے اور اسے ڈر نہیں لگتا وہ جانتا ہے کہ انسان ایک بے بس ذرہ ہے جس کے چاروں طرف خاموشی کا بحرِ زخار ہے۔ مگر وہ غرور سے تن کر چلتا ہے جیسے کون و مکاں کا فرماں روا ہو۔ فکر عظیم، سبک رو اور آزاد ہے۔ وہ کائنات کا نور ہے اور انسان کا شرف"

سیدین صاحب کا خیال ہے کہ ارتقائے انسان کی موجودہ منزل میں فکر کی اہمیت پر خاص کر کے زور دینا چاہیئے۔ اگر انسان کے پاس تخلیقی قوت کا اکتشاہ خزانہ نہ ہوتا تو اس کی حیثیت محض ایک پودے کی ہوتی، ایک ذرہ خاک کی جو کائنات کے بے شمار سیاروں میں سے ایک ننھے سے سیارے (زمین) پر دم بھر کے لیے بے بسی کے عالم میں رقص کرتا ہے اور پھر دفعتاً غائب ہو جاتا ہے۔

رجعت پرستی کی مذمت

سیدین صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ انسان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت کچھ ترقی کی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کی یہ ساری ترقی اسی کے تخلیقی امکانات کے مقابلے میں رکھی جائے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:-

"بحیثیت مجموعی ذہن انسان اب تک لکیر کا فقیر ہے اور

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اس پر اندھیریاں چڑھی ہوئی ہیں وہ آسانی سے نئے خیالات اور فکر و عمل میں مفید تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ شاید ان جانی چیزوں سے بھڑکنے کی جبلّت اور بے خطر راہ پر چلنے کی خواہش اس نے اپنے پیش رو حیوانوں سے ورثہ میں پائی ہے۔ بہت سے بزدلوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جذبے سے متاثر ہو کر شاعر نے کہا تھا کہ :

سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

قرآن مجید نے اس رجعت پرستی کی ذہنیت کو برا کہا ہے جو اپنے بزرگوں کی رسوم و روایات کا حصار کھینچ لیتی ہے اور اس پہلے خواہ مخواہ حرمت اور تقدس کا غلاف چڑھا دیتی ہے جب ان رجعت پرستوں کو حق کا کوئی نیا پیغام پہنچایا جاتا ہے تو وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں کہ انا وجدنا آبائنا علیہا (یعنی ہم نے تو اپنے بزرگوں کو اسی راستے پر چلتا دیکھا ہے ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں) اس شخص کا خیر مقدم کرنے کے بجائے جو ایک نئی بصیرت یا زندگی کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے یا انجانی ذہنی اور اخلاقی سرحدوں کا کھوج لگاتا ہے، اسے سماج کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے بہت سے پیغمبروں، مصلحوں، رشیوں کی داستان حیات اس حقیقت کی تفسیر ہے اور یہ رویّہ صرف اخلاقی زندگی تک محدود

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

نہیں بلکہ اکثر عملی اور سماجی دنیا میں بھی اہم ترین جدّتوں — اور تبدیلیوں کو لازمی طور پر خطرناک سمجھ کر ان کی مزاحمت کی جاتی ہے بقول ایک مصنف کے تقریباً ہر شخص کو جو آرٹ اور سائنس اور ایجاد و اختراع کی راہ میں ہراول بن کر قدم رکھتا ہے معمولی سے معمولی جدت کو لوگوں سے منوانے کے لیے خود ساختہ تعصب یا بے ساختہ حماقت کی ایک ٹھوس دیوار سے سر ٹکرانا پڑتا ہے؛ اس میں شاید اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اکثر ان تعصبات کو تقویت حاصل ہوتی ہے ان معاشی اغراض کی بدولت جن کا فائدہ جدید کی مخالفت اور قدیم کی تائید میں ہے۔" (فکر انسانی کا ارتقاص ۶۹ - ۷۰)

علم کا مقصد

سیدین صاحب علم کا مقصد متعین کرتے ہوئے بہت سی ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتے ہیں جو آجکل عام طور پر تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلی ہوئی ہیں :-

"بہت سے لوگ جن میں یونیورسٹیوں کے بعض تعلیم یافتہ عالم بھی شامل ہیں، سمجھتے ہیں تحصیل علم کی علت غائی صرف مادّی چیزیں بنانا اور ان کے ذریعے دولت میں اضافہ کرنا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم کا افادی مقصد بھی اہم ہے مگر یہ بات بھولنے کی نہیں کہ علم فی نفسہٖ ایک انتہائی قابل قدر چیز ہے اور اگر تعلیم نوجوانوں کے ذہن میں علم کی محبّت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پیدا نہ کر سکے تو وہ اپنے ایک بنیادی مقصد میں ناکام رہے گی اسکول یا یونیورسٹی کی تعلیم سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ گویا حساب کے بھی کھاتے میں ہمیں فوری منافع دکھا سکتی ہے۔ وہ تو تعلیم نہ ہوئی، بنئے کا بیوپار ہوا۔ اس کے فائدے کو صرف روپے آنے پائی کی شکل میں اس طرح ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہیں کرنا چاہیے کہ محض کاروباری لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔ ان کی نظر میں جو علم آج بے فائدہ معلوم ہوتا ہے ممکن ہے وہ آگے چل کر بہت بیش بہا اور عملی طور پر مفید ثابت ہو۔ تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں خالص، علمی تحقیقات اور بے غرض سائنسی دریافتوں سے بڑے دور رس عملی نتائج نکلے ہیں۔"

(فکر انسانی کا سفر ارتقاص ۸۵)

زبان، زندگی اور تعلیم

سیدین صاحب نے سورت یونیورسٹی کی دعوت پر دو لکچر "زبان، زندگی اور تعلیم" کے موضوع پر دیے تھے جو انگریزی میں تھے۔ بعد میں انہوں نے اردو داں طبقہ تک اپنے خیالات پہنچانے کے لیے کچھ ترمیم اور ردّوبدل کے ساتھ ان دونوں خطبات کو اردو میں منتقل کر دیا جو کتاب کی شکل میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع ہوئے۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں:۔

"میں اس مختصر کتاب میں یہ بحث اٹھانا چاہتا ہوں کہ زبان

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کا زندگی اور تعلیم میں کیا مقام ہے۔ اس موضوع کا انتخاب میں نے دو وجہوں سے کیا ہے اوّل تو یہ کہ زبان کے معجزے اور لفظوں کے جادو نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ زبان نے انسان کی زندگی کو اس قدر مالامال کیا ہے اور اسے اتنی قوت بخشی ہے کہ وہ ایک طرح سے انسان اور دوسرے حیوانوں میں ایک امتیازی فرق بن گئی ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوان ناطق، کا لقب دیا گیا ہے۔ دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک زبان کو تعلیم میں اپنا مناسب مقام نہیں ملا اور ہم نے اس کی اہمیت کو پوری طرح سے نہیں پہچانا۔ چاہتا ہوں کہ ہماری تعلیم گاہوں خصوصاً اسکولوں میں زبانوں کے سکھانے میں شاید ضرورت سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے اور عام طور پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ نصاب تعلیم پر زبانوں کا غیر ضروری تسلط ہے۔ میں اس اعتراض کو قبول کرتا ہوں لیکن باوجود اس کے میرا دعویٰ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ میں وقت کی مدت ــــ کا ذکر نہیں کرتا میرا خیال یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے استادوں اور طلبہ کو اس بات کا احساس نہیں کہ زندگی میں جو نصاب تعلیم سے کہیں زیادہ بڑی چیز ہے، زبان کی کیا اہمیت ہے۔ میرا اشارہ مضمون کے پھیلاؤ کی طرف نہیں بلکہ اس کی گہرائی کی طرف ہے۔ اس کی کمیت کی طرف نہیں اس کی کیفیت کی طرف ہے اس کے فوائد اور لغت کی طرف نہیں بلکہ الفاظ کے صحیح استعمال

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کی طرف ہے جب ان کو معنی کا پیالہ بنایا جائے، جب ان کو عظیم اور پرخلوص خیالات اور جذبات کی شراب سے بھرا جائے جو انسانی تجربوں کی پیداوار ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم زبان کو کیا دے سکتے ہیں اور اس سے کیا حاصل کر سکتے ہیں۔ میں زبان کی وکالت کرنا اور یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس کو ہماری زندگی اور تعلیم گاہوں میں کیا مقام حاصل ہونا چاہیے۔" (ص ۹)

آگے چل کر سیدین صاحب زبانوں کو سکھائے جانے کا مقصد متعین کرتے ہیں۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں زبانوں کو کیوں سکھایا جاتا ہے؟ اس لیے کہ وہ نصاب میں شامل ہیں؟ اس لیے کہ وہ خواندگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں جس کے بغیر کوئی شخص اپنے روزمرہ کے کاروبار کو ٹھیک طریقہ پر نہیں چلا سکتا؟ میں ان مقاصد کو تسلیم کرتا ہوں لیکن انہیں کافی نہیں سمجھتا۔ اگر زبان کی تعلیم کا یہی محدود مقصد سمجھا جائے اور اس کو سکھانے اور سیکھنے والے اس کے گہرے اور وسیع تر امکانات سے بے خبر ہوں، اگر وہ یہ نہ دیکھ پائیں کہ وہ ہماری زندگی، ہمارے فکر اور ہماری تہذیب کا کس قدر اہم حصہ ہے اور اس نے کس کس طرح زندگی کو مالا مال کیا ہے، تو ہماری حالت ایسی ہوئی جیسے کوئی سمندر کے کنارے بیٹھ کر کنکریوں سے کھیل رہا ہو اور اس کے سینے میں جو موتی پنہاں ہیں ان کی طرف سے وہ مطلق بے خبر ہو۔ کالج میں جا کر طلبہ علم عروض یا اصول تنقید

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن اس سے بھی صورت حال بہتر نہیں ہوتی کیونکہ ان کا کوئی واضح رشتہ زندگی کے تقاضوں اور مطالبات سے نہیں ہوتا بلکہ انہیں ایک اصطلاحی علم کے طور پر حاصل کیا جاتا ہے "

(ص ۱۰)

سیدین صاحب انسانی زندگی کے امکانات کا تجزیہ کرتے ہوئے انسان کا رشتہ دو دنیاؤں سے بتاتے ہیں ان میں سے ایک تو انسان کی خارجی دنیا ہے جس میں عمل کا کاروبار ہوتا ہے۔ دوسری دنیا انسان کی اپنی اندرونی ہے جس کو مشہور عیسائی مفکر ٹائل ہارڈ دی شاروان (TEILHARD DE-CHARDEN) نے (NOOSPHERE) کا نام دیا ہے۔ انسان کی اس اندرونی دنیا کو من کی دنیا بھی کہتے ہیں جو فکر اور جذبات کی دنیا ہے اور اسی دنیا سے زبان و ادب، شاعری آرٹ اور موسیقی، سائنس اور فلسفہ ادبی پوری قوت اور حسن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس مقام پر سیدین صاحب انگلستان کے مشہور سائنس داں اور مفکر جولین ہکسلے (JULIAN HUXLEY) کے حوالے سے کہتے ہیں "اندرونی دنیا میں انسان کے لیے کتنی دولت لازوال ہے جس کو وہ چاہے تو حاصل کر سکتا ہے گزرے ہوئے لوگوں کی فکر کی یلغار میں اور ان کے فلک پرواز آدرش اس کا معلم علم قدما کی حکمت کے خزانے اور ہماری دنیا کے شاعروں اور فن کاروں کے تخلیقی تخیل کے شاہکار۔ ان کے علاوہ خود اس کی فطرت میں اس کے بہت سے مددگار ہیں۔ یعنی اس کا علم اور تجربہ اس کی مسرت اور احترام، اس کے تخلیقی عقیدے اور اخلاقی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

مقاصد، اس کی سعی پُرجوش اور اس کی محبت جو ساری دنیا کو اپنے دامن میں لے سکتی ہے۔"

(THE HUMANIST FRAME P.19)

سیدین صاحب کے نزدیک یہ اندرونی دنیا جو انسان نے خود بنائی ہے۔ اس کی خارجی دنیا سے زیادہ وسیع اور معنی خیز ہے اور خارجی دباؤں اور قوتوں کی اس درجہ تابع نہیں۔ اس سلسلے میں سیدین صاحب نے اقبال کی ایک چھوٹی سی بلیغ نظم کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جس میں تن کی دنیا اور من کی دنیا کا مقابلہ اس طرح کیا گیا ہے ؎

من کی دنیا ؟ ـــــ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا ؟ ـــــ تن کی دنیا سُود و سَودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیدین صاحب کا خیال ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین، اہلِ نظر، اولیاء اور پیغمبروں میں ایک مشترک خصوصیت یہ تھی کہ ان کی یہ اندرونی دنیا جس کے فانوس میں ان کی روح کا جلوہ نظر آتا تھا، عام لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُر معنی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"جب دنیا میں صحیح قدروں کا رواج ہوتا ہے تو شاعر، مفکر اور سائنس داں اور ادیب کا رُتبہ سرمایہ دار اور تجارت اور صنعت و حرفت کا کاروبار کرنے والوں کے مقابلے میں اونچا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دنیاداروں کے نزدیک مفکر، مصنف، ادیب وغیرہ عملی آدمیوں کے مقابلے میں جو مختلف قسم کا بیوپار کرتے ہیں کم اہم ہوتے ہیں کیوں کہ ان کا کاروبار محض لفظوں کا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ الفاظ اور خیالات جو ان کی گود میں نشوونما پاتے ہیں، دولت اور مادّی چیزوں کی کثرت اور سامان جنگ سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں۔"

(ص ۱۲)

امریکہ کے ایک نام ور مفکر لوئیس مفورڈ LEWIS MUMFORD نے بھی بعینہٖ یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"اگر انسان اپنی حیوانی حدوں کو توڑ کر ان سے بلند ہو سکا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے الفاظ اور خوابوں کے ذریعہ اپنے لئے ایک ایسی سرزمین کے دروازے کھول لیے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہیں۔ جس کو کسی ہل یا ہتھوڑے کے ذریعہ نہیں کھول سکتے۔
اس نے ان سوالوں کو اٹھایا ہے جن کا پورا تشفی بخش جواب
صرف اس کی ساری عمر میں بلکہ تہذیب کے کسی ایک دور
میں بھی نہیں مل سکتا۔"

سیدین صاحب کا خیال ہے کہ یہ سوالوں کا اٹھانا، جو زبان کی تربیت اور مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ انسان میں عقل کا آغاز ہے، ان کی اہمیت جوابوں سے بھی زیادہ ہے کیوں کہ سوال کو صحیح طور پر پوچھنا صحیح جواب حاصل کرنے کے لئے ایک شرط لازم ہے سقراط کا قول ہے کہ :-

" وہ زندگی انسان کے شایاں شان نہیں جو اپنی پڑتال اور احتساب خود نہ کرے۔"

اس کی تشریح کرتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں :-

" یعنی وہ زندگی جس میں نہ شک و شبہ کو دخل ہو، نہ مشکل سوالات اٹھائے جائیں، نہ کسی مقررہ نظام کو چیلنج کیا جائے۔ ایسی صورت میں انسانی زندگی حیوانی سطح سے اونچی نہیں اٹھ سکتی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے حیوان اس قسم کے سوالات نہیں پوچھتے! پھر کتنا بڑا المیہ ہے یہ کہ دنیا میں بیشتر لوگ اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر قانع ہیں اور ان ناگوار حالات کو جن میں وہ رہتے ہیں، بغیر چون و چرا بغیر ذہنی اور عملی جد و جہد کے قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ کہ جب

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کوئی پیغمبر انسانیت کا ایک نیا پیغام اپنی قوم کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ابتدا میں ہر کوئی اپنی حالت پر قانع ہے۔ اور اسے یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ حق اور خیر کی مسلسل تلاش میں شریک ہو، جب کسی قوم کی اپنی آب و ہوا اس قسم کی ہو جاتی ہے تو وہ نہ علمی اعتبار سے ترقی کر سکتی ہے نہ روحانی اعتبار سے، بلکہ اکثر اس کی مادی ترقی بھی رُک جاتی ہے۔ وہ نہ اپنی کمزوریوں کی کھوج لگا سکتی ہے نہ اپنے پوشیدہ امکانات کا، یعنی وہ کیا کچھ بن سکتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطن بھائیوں کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ پاتے، اور تدبر اور تفکر کی جرأت رندانہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ خود کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ انسان خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے اندر دیکھے اور اپنے میں تعصب اور جنبہ داری کے جو پوشیدہ یا کھلے میلانات ہیں ان کو دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تعصب اور جنبہ داری بیشتر انسانوں کی زندگی کو تباہ کر دیتی ہے اور اس زہر کا اثر صرف ہمارے افکار، جذبات اور اعمال ہی کو مسخ نہیں کرتا، بلکہ اس کی چوٹ ہماری زبان پر بھی پڑتی ہے۔ یہ لفظوں کی قیمت گھٹا دیتا ہے۔ ان میں غلط معنی رکھ دیتا ہے۔ ان کے ذریعے بے وقوف اور سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور اُن کے گھٹیا جذبات اور تعصبات کو اُبھارتا رہتا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہے اور انہیں خواہش موت کی سیوا میں استعمال کرنا ہے یعنی فساد اور بلوے کرانا، زندگی کے احترام کو نظر انداز کرنا ہے، رحم اور ہمدردی کے جذبات کا گلا گھونٹنا"۔

(ص ۱۳)

فکر اور گفتگو کا دوغلاپن

سیدین صاحب فکر اور گفتگو کا دوغلاپن کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں ایک انگریز مصنف اورول (ORWELL) کی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ناخواندہ یا نیم تعلیم یافتہ لوگوں کی زندگی ہی نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کے چہرہ مکر کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ سیدین صاحب ایسے لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں :-

"یہ وہ لوگ ہیں جو قصداً زبان اور خیال کو ذلیل کرتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے ناپاک مقاصد حاصل کر سکیں۔ ابھی کچھ سال پہلے نازیوں، فاشسٹوں اور کمیونسٹوں نے بہت بڑے پیمانے پر اس حربے کو استعمال کیا تھا لیکن یہ خیال نہ ہو کہ یہ محض انہیں ملکوں میں ہوا جو آمریت کے زیر اقتدار تھے ؎

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس کی کم و بیش اتنی ہی مکروہ مثالیں ان ملکوں میں بھی ملتی ہیں جو خود کو جمہوری کہتے ہیں۔ اس کی وجہ [illegible]

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ان کی سیاسی بحثوں اور ہنگاموں میں ملتا ہے بلکہ ان کے پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ــــ ان کا مرکزی اظہار پایا جاتا ہے۔" (ص ۱۴)

سیاست کے میدان میں زبان کی اہمیت :-

سیدین صاحب اس سلسلے میں چند مغربی ممالک کی مثالیں دیکر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہاں کس طرح زبان کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ پھر وہ ہندستان اور پاکستان کے مکروہ واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس سے یہ خوش فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے کہ ہم اس معاملے میں دوسروں سے بہت بہتر ہیں کیوں کہ ہم نے بھی زبان کے سلہ کی قیمت گرائی ہے، خاص کر ایک ایسے میدان میں جہاں یہ فعل سب سے زیادہ خطرناک اور شرمناک ہے یعنی سیاست کے میدان میں۔ مثلاً وطن دوستی جس کا مطلب ہے اپنے وطن سے محبت کرنا اس کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینا، اس کی کمزوریوں پر جرأت اور صداقت کے ساتھ تنقید کرنا، خاص حالات میں اس کی حفاظت کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دینا اس پاک اور شریف جذبے کو محدود اور ذلیل کر کے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے قومی اغراض و مفاد کو نظر انداز کر کے اپنے چھوٹے سے گروہ یا جماعت یا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ذات یا علاقے کا فائدہ ڈھونڈنا خواہ اس میں ملک کا کتنا ہی نقصان ہو۔ بہار، بنگال، گجرات، مہاراشٹر اور ملک کے دوسرے علاقوں میں آئے دن جو بلوے اور قتل و غارت کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں ان کے ذمہ دار افراد اور جماعتیں بھی غالباً یہ سمجھتی ہیں کہ وہ وطن دوستی کا حق ادا کر رہی ہیں! وہ بدنصیب شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی تنگ نظری اور تعصب کے ذریعہ، جس میں نہ شرافت کے لیے جگہ ہے، نہ رحم کے لیے، نہ فیاضی کے لیے، نہ انسانیت کے لیے، وہ نہ صرف اپنے خاص گروہ بلکہ سارے ملک کے مفاد کی خدمت کر رہے ہیں اس کی بہت بُری اور مکروہ مثال ان واقعات میں ملتی ہے جو مشرقی پاکستان میں پیش آرہے ہیں جہاں فوجی حکومت نے اپنی بربریت کی پالیسی پر وطن دوستی اور وطن کی سالمیت کے تحفظ کا نقاب ڈال دیا تھا اور یہ رکیک اور ذلیل حرکتیں دنیا بھر میں ایک ایسے زمانے میں کی جارہی ہیں جب حب وطن کے پرانے تصور پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اس وقت جو نئی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں اور نئی قوتیں بروئے کار آرہی ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ہمارا وطن دوستی کا تصور انسان دوستی کے تصور سے نہ ٹکرائے۔ اس وقت میرا وطن خواہ وہ حق پہ ہو یا ناحق پر، ایک بد دیانت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

بے اصول اور خطرناک نعرہ بن گیا ہے۔ جو ہماری بیشتر بین الاقوامی گتھیوں کے لیے ذمہ دار ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ محض زبان کا سوال نہیں اس کے لیے ہمارے نظریہ حیات میں انقلاب کی اور ہمارے فکر و عمل کے سانچوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد میں کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب بہت سی قوتیں اور ادارے اور عوامل مل کر کام کریں لیکن میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ حبِ وطن کے تصور کو ناپاک کرنے میں زبان کی خرابی کو بھی بڑا دخل ہے۔ جب تک زبان کی تطہیر نہ کی جائے فکر و عمل کی پاکی بھی دشوار ہے۔" (ص ۱۷)

سیدین صاحب بہت سے روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی خبریں اور ایڈیٹوریل ذمہ داری کے صحیح احساس سے خالی ہیں۔ نہ زبان و فکر میں اعتدال و توازن نظر آتا ہے اور نہ یہ خواہش کہ مسئلوں کے دونوں یا مختلف پہلوؤں کو غیر جانب داری سے دیکھا جائے وہ جب افراد یا پارٹیوں کی پالیسی کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور پر ان کی سفید یا سیاہ تصویریں کھینچتے ہیں گویا درمیانی رنگوں کا وجود ہی نہیں۔

سیدین صاحب اخبار نویسوں اور اہل سیاست میں بعض دیانتدار لوگوں کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں جو بے باکی کے ساتھ غیر جانب دارانہ تنقید کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد کی تعداد اتنی کم ہے کہ اس کی وجہ سے عام صورتِ حال نہیں بدل سکتی۔ اس سلسلے میں سیدین صاحب گاندھی جی کی مثالیں پیش کرتے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہیں جنہوں نے زندگی بھر اس بات پر زور دیا کہ زبان کے استعمال میں عدل اور سچائی سے کام لو، مبالغہ سے پرہیز کرو، اس کو نرمی اور ترغیب کے انداز میں برتو۔ اور جب تمہیں تلخ حقیقتوں کو بھی بیان کرنا ہو تو انہیں ایسے لفظوں میں بیان کرو جن سے کسی کی غیر ضروری دل آزاری نہ ہو۔ گاندھی جی کے اخلاق اور تحریر کے سلسلے میں سیدین صاحب نے گاندھی جی کا ایک قول نقل کیا ہے:-

"اپنے ایمان کی سلامتی کی خاطر میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں غصہ یا بدنیتی سے مغلوب ہو کر لکھوں۔ میں بے ضرورت اور بے وجہ نہیں لکھ سکتا، محض لوگوں کے جذبات بھڑکانے کی خاطر نہیں لکھ سکتا۔ بعض دفعہ میری خود پسندی بھی مجھ سے کوئی بھڑکتا ہوا جملہ لکھاتی ہے یا میں غصہ میں آکر کوئی سخت لفظ کا استعمال کرتا ہوں اپنی تحریر میں سے ان خس و خاشاک کو نکالنے میں بہت دفعہ مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ ایک بہت مفید شغل ہے۔"

سادہ نگاری

سیدین صاحب مبتدیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سادہ الفاظ اختیار کریں اور بڑے بلند آہنگ الفاظ کے استعمال سے بچیں۔ سیدین صاحب مثال کے طور پر برٹرینڈ رسل کو پیش کر سکتے ہیں جو ان کے نزدیک ایک بڑا صاحب طرز ادیب تھا اور زبان کو بڑی امتیازی شان کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ رسل نے کہا ہے کہ:-

"جہاں ایک آسان لفظ کام دے سکے وہاں مشکل لفظ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

استعمال نہ کرو۔"

یہی خیال کیمبرج یونیورسٹی کے نامور پروفیسر آرتھر کوئلر کوچ کا بھی ہے جس کی عبارت کا تقریباً یہ مطلب ہے کہ:۔

"اگر تمہیں کبھی نہایت شدید خواہش ہو کہ بڑی فصیح و بلیغ عبارت لکھو تو لکھ ڈالو لیکن اس کو چھپوانے سے پہلے جلا دو، اپنی اس چہیتی تحریر کا خود ہی گلا گھونٹ دو۔"

سادہ نگاری کی مثالیں دیتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں:۔

"مولانا آزاد اردو نثر نگاری میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے تھے لیکن اگر ہم ان کی ابتدائی تحریروں اور انتخاب الفاظ کا مقابلہ ان کی بعد کی تحریروں سے کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح باوجود اپنے انداز تحریر کی شوکت کے، ان کا میلان زبان میں سادگی پیدا کرنے کی طرف رہا۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کے بیان کی قوت اور حسن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پریم چند اردو اور ہندی زبانوں کے اعلیٰ ادیب تھے ان کا مقام دونوں زبانوں میں اس وجہ سے قائم رہے گا کہ انہوں نے سادہ عام فہم زبان لکھنے کی کوشش کی اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ گاندھی جی کی انگریزی نثر میں بھی یہی صفت تھی۔ اس کی مثالیں ان کے ہاں جا بجا ملتی ہے۔ مغربی تہذیب کے شاندار روکار کے پس پشت جو خرابیاں اور برائیاں چل رہی تھیں اور جن کا بڑھتا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہوا سایہ دنیا کے دوسرے حصّوں کو بھی تاریک کر رہا تھا، ان کا گاندھی جی پر بہت اثر تھا اور وہ اس کی وجہ سے ہمیشہ متفکر رہتے تھے۔ لیکن جس وقت انہوں نے ان کے خلاف آواز اٹھائی تو کن الفاظ میں ؟ کوئی لعن طعن نہیں، کوئی سخت کلامی نہیں، ان میں تو صرف خلوص اور سچائی کی تھی "

(ص ۱۹)

سیدین صاحب نے گاندھی جی کا مندرجہ ذیل قول پیش کیا ہے :-

" مجھ میں کوئی چیز ایسی ہے جو مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں اپنے انتہائی دکھ کا اظہار کروں وہ کہتی ہے ہمارا فرض ہے کہ تم دنیا کی رفتار کی مخالفت کرو، خواہ تمہیں بالکل تنہا ایسا کرنا پڑے۔ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو خواہ وہ تمہیں خون بھری نظروں سے دیکھتی ہو۔ خوف نہ کرو۔ اس بات کی گواہی دو جس کی خاطر تم نے اپنی زندگی بسر کی ہے اور جس کے لیے ممکن ہے تمہیں جان دینا پڑے "

گاندھی جی کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے سیدین صاحب لکھتے ہیں :-

" اصل انگریزی عبارت میں کوئی غیر ضروری یا گراہ کن لفظ نہیں، کوئی ایسا لفظ نہیں جو ایک ہائی اسکول کا اوسط درجے کا طالب علم نہ سمجھ سکے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے۔ بیان کی اس سادگی کا فکر کی سلاست اور دیانت سے گہرا تعلق ہے،

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

یہ کسی مصنف کا نقطۂ آغاز نہیں بلکہ اس کا شاندار انجام ہے۔
اگر ہمارے خیال میں صفائی نہ ہو، اگر وہ ہمارے دل کی گہرائیوں
سے نہیں بلکہ زبان کی نوک سے نکلے تو ہم بیان میں سادگی کی وہ
دل نشین شان نہیں پیدا کر سکتے، جس کی جڑ خلوص ہے۔ ہر
مصنف کو انفرادی طور پر یہ حق ضرور حاصل ہے کہ وہ اپنی تخلیقی
جبلتوں کے مطابق اپنے اسٹائل کو ڈھالے اور ادب کے ایوان
میں مختلف انداز بیان کے لیے گنجائش ہے اس میں نہ سنسر شپ
کے لیے گنجائش ہے نہ کسی خاص یکسانیت کے پرچار کی۔"

(ص ۲۰)

سیدین صاحب بچوں کی تعلیم، روزمرّہ کی گفتگو، اخبار تو سیسی اور عوام
کے لیے کتابوں کے سلسلے میں خاص طور پر سادگی تحریر پر زور دیتے ہیں:-

"یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک بہت سے لوگوں کو، جو
بچوں یا نیم تعلیم یافتہ بالغوں کے لیے لکھتے ہیں اس بات کا
اندازہ نہیں ہوا کہ ان کی توجہ کو حاصل کرنے اور دل چسپی کو
ابھارنے کے لیے کس قسم کی زبان ضروری ہے یہ موقع اپنی
مفروضہ قابلیت کے اظہار کا نہیں بلکہ انکسار کے ساتھ یہ
سوچنے کی ضرورت ہے کہ پڑھنے والے کس زبان کو بہ خوبی
سمجھ سکتے ہیں۔ بولنے اور لکھنے کی زبان میں جس قدر قریبی تعلق
ہو سکے اچھا ہے۔ میں بعض دفعہ دیکھتا ہوں کہ ابتدائی درجوں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

میں ہندی پڑھنے والے بچوں کی درسی کتابوں میں ایسے لفظ خاص کر کے استعمال کئے جاتے ہیں جن کا مطلب استاد کو انہیں ہندستانی یا سادہ اردو میں سمجھانا پڑتا ہے حالانکہ وہ لفظ بھی ہندی لفظ میں شامل ہے اور ان کو استعمال کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ زبان کے بے جا تعصب کی وجہ سے بچوں کو پڑھانے میں بدیہی اصولوں کو نظر انداز کرنا دانشمندی کا کوئی خاص ثبوت نہیں۔ یہ گرا لیا ہے جو زبان کے استادوں اور ریڈیو کے کارپرداز کرتا دُں کو دامن میں باندھ کر رکھنا چاہیے۔"

(ص ۲۰-۲۱)

زبان کا تعلق اخلاق سے :-

سیدین صاحب نے زبان کا تعلق اخلاق سے جس حد تک ہے اس کی نشان دہی اس طرح کی ہے :-

"میں نے اس بات پر زور دیا کہ زبان کے استعمال میں ہمیشہ نرمی اور اخلاق کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے لیکن اس "اخلاق" کا وہ مطلب نہیں جو عام طور پر لیا جاتا ہے یعنی سچائی کو ظاہر نہ کرنا یا جائز تنقید سے پرہیز جیسا ہمارے ملک میں بدقسمتی سے ایک عام رواج ہو گیا ہے۔ اس ذہنیت کے پیدا کرنے میں ہمارے سیکڑوں سال کے جاگیر دارانہ نظام کو بھی دخل ہے جہاں ہر شخص

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کے لیے ایک مقررہ جگہ تھی کسی کی اونچی، کسی کی نیچی اور نیچے بیٹھنے والوں کو نہ یہ جرأت تھی نہ اختیار کہ اونچے بیٹھنے والوں پر کسی قسم کی تنقید کر سکیں یا ان کے خلاف کوئی ناگوار بات کہہ سکیں۔ یہ روایت ابھی تک قایم ہے، اگرچہ اب اس کے خلاف جو تحریک پیدا ہوئی ہے وہ بھی اعتدال کی حد سے گزر کر ایک انتہائی شکل اختیار کر رہی ہے۔ ادب کو جس کا شمار ہمیشہ صفات عالیہ میں رہا ہے اور اس کا مطلب ہے بزرگی، کمال، بے غرضانہ خدمت اور احسان کا اعتراف ایک بورژوا کمزوری قرار دیکر رد کر دیا گیا ہے میں جب نیکی یا شرافت یا جوش اخلاقی کا منھ دیکھتا ہوں تو ان سے یہ نہیں پوچھنا چاہتا کہ تم بورژوا ہو یا پرولتاری جیسے لباس بدل لینے سے انسان نہیں بدل جاتا، اسی طرح کوئی نیکی یا خوبی میرے لیے محض اس وجہ سے اپنی کشش نہیں کھو دیتی کہ اس کو پرولتاری یا بورژوا کا نام دے دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں میرا مقصد اس تحریک کی تنقید نہیں (وہ تو شاید ان انتہائی منزلوں سے گزر کر اور تاریخی ٹھوکریں کھانے کے بعد اعتدال کی طرف آجائے) بلکہ اخلاق کا جو غلط مفہوم مدت سے رائج ہے اس کی تنقید کرنا ہے۔ ہم لوگ بہ ظاہر سچ کہنے سے اس وجہ سے پرہیز کرتے ہیں کہ اس میں دوسرے کی دل شکنی ہوگی خصوصاً جب وہ دوسرا کوئی صاحب قوت و اختیار شخص ہو اور اس سے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہماری کوئی توقعات وابستہ ہوں۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم میں اتنی جرأت نہیں کہ بے باکی کے ساتھ ناگوار سچائی کو ظاہر کر سکیں اور اس کے نتائج کو بھگتنے اور اس کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں ہم اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی ایسا کرنے سے کتراتے ہیں۔"

(ص ۲۱ - ۲۲)

سیدین صاحب کا خیال ہے کہ قوم کے افراد میں جرأت گفتار و کردار ہونا چاہیے۔ بزدلوں، خوشامدیوں اور جھوٹ کا کاروبار کرنے والوں کی قوم کبھی ایک شریف اور طاقتور قوم نہیں بن سکتی۔ اس بارے میں سیدین صاحب گاندھی جی کے حسب ذیل قول کو شمع راہ بناتے ہیں:۔

"کوئی ناگوار لفظ بولنا یا لکھنا جب کہ بولنے یا لکھنے والا اس کو سچ کہتا ہو، ہنسا کا ثبوت نہیں۔ ہنسا کی اصل یہ ہے کہ ہمارے الفاظ یا خیال یا عمل کی پشت پر ہنسا کی نیت ہو۔ لوگ بعض دفعہ مناسب اور نامناسب زبان کا صحیح تصوّر نہیں سمجھ پاتے وہ لوگوں کی دل آزاری سے ڈرتے ہیں اور اس وجہ سے حق کا اظہار نہیں کر سکتے ایسی قوموں کا انجام بالآخر ریاکاری پر ہوتا ہے لیکن اگر افراد یا سماج یا قوم میں اہنسا کی شان پیدا کرنی ہے تو سچ بولنے کی عادت ڈالنا لازم ہے۔ خواہ وہ اس وقت کتنا ہی ناگوار اور نامقبول معلوم ہو۔"

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

زبان سب سے زیادہ موثر آلہ :۔

فرانس کے نامور فلسفی برگساں (BERGSON) نے انسان کی جس بڑی صلاحیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہے خود کو بنانے کی صلاحیت۔ (CREATION OF THE SELF BY THE SELF) برگساں کے نزدیک یہ آرٹ ان تمام آرٹس سے افضل ہے جن کے ذریعہ انسان نے اپنی زندگی کو مالا مال کیا ہے۔ وہ اپنی حیوانی میراث کیا، اس انسانی میراث پر بھی قانع نہیں جو اس کو ملی ہے۔ لہذا مسلسل اس جدوجہد میں لگا رہتا ہے کہ اس میں اور اضافہ کرے، گو مختلف لوگ مختلف قسم کے اضافے کرنا چاہتے ہیں اس کوشش میں زبان اور خواب دیکھنے کی صلاحیت برابر اس کے ساتھی رہے ہیں۔ سیدین صاحب اپنے نقطۂ نظر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" اسی کے (انسان کے) عزیز ترین خیالات اور بلند سے بلند جذبات بھی مبہم اور غیر موثر رہیں گے اگر وہ انکو مناسب الفاظ میں نہ ظاہر کر سکے اور صرف عزیزوں اور دوستوں ہی کو نہیں بلکہ ان سب لوگوں کو جو انہیں سمجھتے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اپنی ذات کو بنانے اور سنوارنے میں اور دوسروں کو سمجھنے اور ان کے دل کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے زبان ہی سب سے زیادہ موثر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

آلہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے پاس جس قدر اوزار اور آلات ہیں
ان کی مدد سے اس نے خارجی دنیا کے قفل کھولے ہیں لیکن زبان
کی وساطت سے اس نے نہ صرف اپنے ہم جنسوں کے دل و دماغ
بلکہ خود اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں نظر ڈالی ہے اور صرف
اس کی اپنی ہی زبان نے انسانی ذات کے بھید نہیں کھولے
بلکہ دنیا میں جو بڑے بڑے صاحبان تحریر و تقریر شاعر، آرٹسٹ
ماہرین نفسیات اور فلسفی ہیں اور گزرے ہیں ان کے فکر اور
کارناموں نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اس کی ذات پر روشنی
ڈالی ہے۔ اس طرح اپنے سب ہم عصروں کے ساتھ خواہ وہ
قریب ہوں یا دور، مکالمہ قایم کر سکا ہے اور دوسری نسلوں
اور تہذیبوں اور عصروں کے ساتھ بھی جس میں قدیم یونانی،
رومی، چینی، مصری، ایرانی، ہندو، عرب، مغل اور اہل مغرب
وغیرہ سب شامل ہیں۔ وہ ان زمانوں کے ساتھ بھی رشتہ
قایم کر سکتا ہے جو ابھی مستقبل کی گود میں سوئے ہوئے ہیں
اور ان کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتا ہے، اس طرح کہ وہ بچوں
کو پہلے ان کی مادری زبان سکھاتا ہے اور پھر دوسری زبانیں،
تاکہ ایک طرف وہ ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کر سکیں
اور دوسری طرف نسل انسانی کے تمام خزانوں کی کنجیاں ان
کے ہاتھ میں آجائیں تاکہ ان کی مدد سے وہ اپنے مستقبل کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تعمیر کرسکیں۔" (ص ۲۸ - ۲۹)

لفظ کی اہمیت :-

سیدین صاحب لفظ کی اہمیت پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں "لفظ ہر شخص کے لئے بندھی ٹکی چیز نہیں۔ وہ ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح جامد نہیں (اور اب تو پتھر کے جامد ہونے میں بھی شبہ ہے) بلکہ ایک زندہ اور نامی چیز ہے۔ اس کے معنی وہ ہیں جو میں نے، آپ نے، ہم سب نے اپنے استعمال کے ذریعہ اس میں رکھے ہیں یعنی جو ہمیشہ کے لئے مقرر شدہ اور ناقابل تبدیل نہیں بلکہ رفتہ رفتہ وسیع ہوئے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا مطلب دو ایسے شخصوں کے لئے بھی ایک نہیں جو ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ بلکہ ان کے معنی ایک حد تک ہر فرد کے لئے مختلف ہوتے ہیں جس کا انحصار اس کی تعلیم پر اس کے سماجی، اقتصادی اور تہذیبی پس منظر پر اور خود اس کے ذاتی تجربے کی گہرائی اور کیفیت پر ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک ہی شخص لفظوں کو مختلف موقعوں پر اور مختلف متن میں الگ الگ معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کر لینا غلط ہے اور خطرے سے خالی نہیں کہ جو لوگ ایک ہی زبان بولتے ہیں اور ایک ہی لغت استعمال کرتے ہیں ان کا مطلب بالکل واضح ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ اس کے مطلب کو بلاکم و کاست بیان کر سکتے ہیں۔"

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(ص ۳۱)

سیدین صاحب الفاظ کے غیر ذمہ دارانہ استعمال پر توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"لیکن روزمرہ کے معمولی اور غیر معمولی کاروبار میں لوگوں کی مشکلیں آسانی سے حل نہیں ہوں گی اور لوگوں سے میری مراد ناخواندہ یا نوخواندہ اشخاص ہی نہیں بلکہ اس میں بہت سے نامور سیاست داں، مدبر اور ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نمائندے بھی شامل ہیں جن کا پیشہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہونا ہے۔ وہ اہل علم بھی جو علمی انجمنوں میں اہم مباحث کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں وہ اہل ثروت اور کاروباری لوگ بھی جن کا ہاتھ اپنے اور دوسرے ملکوں کی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں کے بنانے یا بگاڑنے میں ہوتا ہے کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر بے اصولی اور بے ایمانی کرتے ہیں، دوسرے لوگوں کو اپنی چرب زبانی کے ذریعہ دھوکا دینا اور بحث میں کسی نہ کسی طرح نکتے جیتنا چاہتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ حق کی تلاش کریں اور اصل صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب وہ بالارادہ ایسا نہیں بھی کرتے تو وہ آزادی، انصاف، مساوات، شاہنشاہیت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

نوآبادیت، نسل پرستی وغیرہ کے الفاظ کو غیر ذمہ دارانہ
طریقہ سے اور ایک دوسرے سے مختلف معنیٰ میں استعمال
کرتے ہیں اور اس طرح بحث غلط فہمیوں کے دلدل
میں پھنس جاتی ہے۔" (ص ۳۲)

یہی نظریہ برنارڈ اور میک شین نے اپنی کتاب 'خودی کے
معنیٰ کی تلاش' (TOWARDS SELF MEANING)
میں پیش کیا ہے۔

"یہ بات تسلیم کر لینے کو بہت جی چاہتا ہے کہ
اگر ایک ہی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں
تو ان کا مطلب بھی ہمیشہ ایک ہی ہوگا۔ اگر
ہم سائنٹفک امور میں اس دھوکے میں آجائیں
تو اس کی وجہ سے زوال اور علمی بد دیانتی
(INAUTHENTICITY) کا راستہ کھل جاتا ہے
(ص ۳۲)

واضح رہے کہ مذکورہ بالا مصنف نے یہ کتاب مشہور
عیسائی مفکر لونارگن (LONARGAN) کے بارے میں لکھی ہے۔
سیدین صاحب اس نظریہ پر اپنی رائے کا اضافہ کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:-

"اس اصول کا اطلاق صرف سائنٹفک امور

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

پر نہیں ہوتا بلکہ ان سے بھی زیادہ سماجی اور انسانی مسائل پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم واقعتاً یہ چاہتے ہیں کہ انسانوں کا مکالمہ بامعنیٰ اور ثمر آور ہو تو ہمیں زبان کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دینی ہوگی۔ نوجوانوں اور بالغوں میں لفظ کا احترام پیدا کرنا ہوگا۔ اور اس کے استعمال میں احتیاط اور نفاست پر زور دینا ہوگا، اس حد تک کہ وہ اس کے غلط یا گمراہ کن یا غیر ذمہ دارانہ استعمال کو اخلاق اور جمالیات کے خلاف ایک جرم سمجھیں۔ کوئی بات تو ہے کہ دنیا کے مقدس صحیفوں میں لفظ کو بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے۔"

(ص ۳۲)

لفظ کی اہمیت ظاہر کرنے کیلئے سیدین صاحب نے مہاکوی ٹیگور کی اس شاندار دعا کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لفظ کس طرح سچ کی گہرائی سے نکلتے ہیں۔ ان کے بغیر آزادی کا خواب دیکھنا بیکار ہے۔ وہ دعا حسب ذیل ہے:-

"جہاں دماغ خوف کے تسلط سے محفوظ ہے اور سر بلند، جہاں خیال آزاد ہے، جہاں دنیا کو چھوٹی چھوٹی خانگی دیواروں کے ذریعہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر دیا گیا جہاں الفاظ سچ کی گہرائی سے ابلتے ہیں۔ جہاں اَن

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تھک کوشش اپنے بازوؤں کو کمال کی طرف پھیلاتی ہے
جہاں عقل کا چشمۂ صافی عادتوں اور رواجوں کے
بھیانک صحرا میں گم نہیں ہو گیا۔
جہاں اے خدا، تو انسانی دماغ کو ہمیشہ بڑھتے
اور پھیلتے ہوئے فکر و عمل کی دنیا میں لے جاتا ہے۔
اے میرے روحانی باپ، میرے وطن کو اُس جہان آزاد
میں بیدار کر!"

اس دعا کا حوالہ دے کر سیدین صاحب اپنے وطن پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں اور لکھتے ہیں :-

"ہمارے وطن میں ٹیگور کی یہ دعا ابھی تک منتظر جواب ہے۔ نہ دماغ بے خوف ہے، نہ سر بلند، نہ علم آزاد ہے، نہ الفاظ سچ کی گہرائی سے نکلتے ہیں۔ وہ تو محض زبان کی نوک پر دھرے رہتے ہیں۔ یہی حال ہمارے ملک کا اور یہی دنیا کا ہے اور یہ وہ زبردست چیلنج ہے جو دنیا کی موجودہ صورت حال تعلیم کے سامنے پیش کرتی ہے۔" (ص ۲۵)

اسی ضمن میں سیدین صاحب نے اردو کے ایک ہم عصر شاعر نازش پرتاپ گڈھی کی ایک بہت خوبصورت اور فکر انگیز نظم کو پیش کیا ہے جس کا عنوان ہے "لفظوں کا ایک" اس میں بقول

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیدین نازش نے بتایا ہے کہ لفظ کتنے مختلف قسم کے، بلکہ متضاد فرائض انجام دے سکتے ہیں اور یہ اس پر منحصر ہے کہ ان کا استعمال کرنے والا کون ہے۔ اور اس کی نیت اور قدریں کیا ہیں۔ لفظ پھول اور شبنم بھی بن سکتا ہے، زخموں کا مرہم بھی بن سکتا ہے جب وہ کسی نبی، ولی، مردِ خدا کی زبان سے نکلے۔ وہ کرشن جی کی بانسری میں گیت، مہاتما بدھ کے لبوں پر شانتی کا اپدیش، مسیح کی زبان سے پہاڑی کا وعظ، سینٹ فرانس، نانک اور چشتی کے لب میں آکر اثر آفریں دعا بن سکتا ہے۔ یہی لفظ ہے جو مسولینی، اسٹالن اور موت اور نفرت کے دوسرے بیوپاریوں کے ہاتھ میں تلوار اور خنجر اور زہر اگلنے والا افعی بن سکتا ہے۔

وہ نظم یہ ہے:-

لفظ ہی پھول بھی ہے، لفظ ہی زنجیر بھی ہے — لفظ ہی زخم بھی ہے، لفظ ہی شمشیر بھی ہے
لفظ ہی خواب بھی اور خواب کی تعبیر بھی ہے

اور لفظوں پہ رہا کرتی ہے دنیا کی نظر — لفظ کو جاننے والے ہی سمجھتے ہیں مگر
لفظ شبنم ہے نہ موتی ہے نہ پتھر ہے نہ آگ — لفظ کے سینۂ خالی میں نہ آہیں ہیں نہ راگ
لفظ کے سایۂ دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ ناگ

لفظ میں نور سمو دیں تو ستارہ بن جائے — دل جو کھو دیں تو لبِ ناز کا بوسہ بن جائے
اور بارود اگر بھر دیں دعا کا بن جائے

لفظ تذلیل ہے، تکذیب ہے عیاری ہے — لفظ سازش ہے، ستم کاری ہے، مکاری ہے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

بربریت ہے تشدد ہے، ستم کاری ہے　　فرقہ بندی ہے، زراندوزی ہے، غداری ہے
آج کا ہر لفظ ہر انسان پہ بہت بھاری ہے

لفظ کو پھر بھی نہ مجرم نہ خطا کار کہو　　لفظ سے کھیلنے والوں کو گنہگار کہو
سانس لیتی ہوئی بارود اگر بولے گی　　لازماً لفظ کے پردے میں لہو گھولے گی
ہے جو دلالوں میں قوت تو بکیں گے الفاظ　　بے ضمیری ہے جو فطرت تو لٹیں گے الفاظ
جیب و دامن کی طرح چاک رہیں گے الفاظ　　گندگی بکھری ہے، ناپاک رہیں گے الفاظ
پوجا بے کیف جو خالی ہو شوالہ دل کا　　لفظ میں نور سموتا ہے اجالا دل کا
لفظ کے سر کوئی تہمت کوئی الزام نہ دو

لفظ تو آج بھی انسان کی طرف تکتا ہے　　لفظ کانٹا ہی نہیں پھول بھی بن سکتا ہے
لفظ انجیل بھی قرآن بھی بن سکتا ہے

لفظ ٹپکائے گا امرت لب گوتم تو ملے　　رقص فرما ہو مگر کوئی کنہیا تو ملے
منتظر ہے کسی چشتی کسی نانک کے لئے　　لفظ ہو جائے گا زندہ کوئی عیسیٰ تو اٹھے
لفظ کہتا ہے سیاہی کا جگر چاک کرو　　ذہن کو پاک کرو، فکر کو بے باک کرو
لفظ کی قوت و عظمت کا ادراک کرو

نطق پر سوز میں شعلہ سا لپک جاتا ہے　　بے ریا ہونٹوں پہ ہر لفظ چمک جاتا ہے
لفظ کہتا ہے پھر ایک بار اجالو مجھ کو　　میں حقیقت ہوں تباہی سے بچالو مجھ کو
میں محبت ہوں کلیجے سے لگالو مجھ کو

انگلیاں ہوں کہ زبانیں ہوں تخیل ہو کہ ذہن　　لفظ ہر خالق الفاظ کو دیتا ہے صدا
دورِ حاضر کی عقوبت سے بچانے والا　　ہے کوئی پھر مجھے پاکیزہ بنانے والا

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہندوستان میں زبانوں کی تعلیم پر تنقیدی نظر:-

سیدین صاحب اپنے ملک میں زبانوں کی تعلیم پر تنقیدی نظر ڈالنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ضرورت ہے کہ ہم زبانوں کی تعلیم پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں کہ ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کس طرح دی جارہی ہے اور اس کا استعمال بالغوں کی دنیا میں کس طرح ہو رہا ہے۔ ہر زبان اور مضمون کے استادوں کا ہر یونیورسٹی کا جس کو قوم کے ضمیر کا فرض انجام دینا چاہیئے اور ان تمام لوگوں کو جو ملک معنی میں یا سیاست کے میدان میں کام کرتے ہیں سب کا فرض ہے کہ وہ زبان کے اس مسئلے میں دلچسپی لیں ہمارے ملک میں تو بالعموم زبان کے مسئلے کا مطلب سمجھا جاتا ہے وہ احمقانہ بلکہ مجنونانہ جنگ جو دیس کی بعض زبانوں میں چلتی رہتی ہے اور جس کی وجہ سے زبان جو لوگوں کے دلوں کو ملانے کا، باہمی مفاہمت کا ایک ذریعہ ہے ایک وجہ اختلاف بلکہ وجہ مخالفت بن کر رہ گئی ہے۔ بہت سے ناعاقبت اندیش، تنگ دل اور تنگ ذہن لوگ اتنا نہیں جانتے کہ زبانیں تو ملک کی دولت ہیں جتنی ان کو ترقی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہوتی ہے ملک کی ذہنی دولت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ اردو اور ہندی کا جھگڑا، ہندی اور انگریزی کا جھگڑا، شمال اور جنوب کی زبانوں کا جھگڑا، وطن کی محبت کا ایک جزو ہے۔ اگر ہم ملک میں مفاہمت چاہتے ہیں، علمی اور ذہنی ترقی چاہتے ہیں تو سب سے بڑی ضرورت یہ نہیں کہ ہم اپنی خالص زبانیں بہ لوک شمشیر اپنے ہموطنوں کے گلے اتار دیں۔ بلکہ یہ ہے کہ کوئی شخص بھی جو زبان بولتا ہے اور لکھتا ہے اس کو پوری توجہ اور کوشش سے سیکھے تاکہ نہ صرف صحیح معنوں میں ایک جیتا ناطق بن سکے بلکہ اس میں وضاحت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو، علم شروع میں زیادہ تر براہ راست تجربے کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لیکن اس میں وضاحت، صحت اور منطقی ترتیب اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب زبان معنی کی گرفت کرتی ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کا موثر رشتہ قائم کرتی ہے، اگر کوئی شخص اپنی یا کسی زبان پر بھی اچھی طرح قابو نہیں رکھتا تو اس کی وجہ سے محض زبان اور ادب کی تعلیم ہی نہیں بلکہ تقریباً سب مضامین کی تعلیم ناقص رہ جاتی ہے جب انگریزی حکومت کے زمانے میں ہم میں سے بہت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سے لوگوں نے اس بات کے خلاف اپنی آواز اٹھائی تھی کہ انگریزی زبان کو کیوں اسکولوں اور کالجوں میں واحد ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہے تو ہماری شکایت یہ تھی کہ اس طرح طلبہ کو جو کچھ سکھایا اور پڑھایا جاتا ہے ان میں سے بیشتر نہ اس کو صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں نہ اس میں اپنے خیالات کو وضاحت کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں یعنی جس زبان کے ذریعہ ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ علم حاصل کریں، فکر کا فن سیکھیں اور پھر اس کو زندگی کے کاروبار میں استعمال کریں، اس پر ان کو اچھی طرح عبور ہی حاصل نہ ہوتا تھا۔ اب بڑی حد تک ہندوستانی زبانوں نے انگریزی کی جگہ لے لی ہے لیکن اس سے اب تک جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ ہمت شکن ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ سے اب تک ہمارے تعلیمی معیار بہتر نہیں ہوئے۔ یہ اس تبدیلی کی مخالفت کا جواز نہیں بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ اس کے ساتھ جو طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ بعض کالجوں اور یونیورسٹیوں کے استادوں نے مجھے بتایا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ہماری اپنی زبانیں اس قدر ناقابل اطمینان طریقے سے پڑھائی جاتی ہیں کہ اکثر طالب علم کسی زبان کو بھی اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ کتابیں خصوصاً اچھے اچھے مصنفوں کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سنجیدہ کتابیں نہیں پڑھ سکتے۔ ان سے نہ لطف حاصل
کر سکتے ہیں نہ فائدہ۔ بعض اوقات اپنے ساتھیوں اور
استادوں سے سنجیدہ مباحث پر باہمی گفتگو بھی نہیں
کر سکتے وہ بعض محدود اور پیش پا افتادہ چیزوں کے
بارے میں گفتگو کر لیتے ہیں لیکن یہ تبادلۂ خیال کی منزل
نہیں بلکہ محض واقفیت اور معلومات کا لین دین ہے جو
علم کا ابتدائی درجہ ہے۔ وہ جو کچھ سیکھتے ہیں اکثر زبانی رٹائی
کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے خیال کو اپنانے
کے لئے ان کے ساتھ تخلیقی جد و جہد کی ہو اور چونکہ ان کو
زبان کا صحیح استعمال نہیں سکھایا جاتا کہ کس طرح وہ خیال
کے موثر اظہار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لئے وہ معنی کا چہرہ
صاف طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ جیسے کسی غلط عینک کو
آنکھوں پر لگا کر دیکھ رہے ہوں۔ اعلیٰ تعلیم کی منزل میں
پہنچ کر بھی ان میں مجرد تصورات کو اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت
پیدا نہیں ہوتی حالانکہ اس وقت وہ محض معلومات حاصل
کرنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ جو معلومات استادوں
سے یا کتابوں سے میکانکی انداز میں حاصل کر لیتے ہیں
(اور وہ اچھی کتابوں سے نہیں بلکہ اکثر بازاری نوٹوں سے)
اس کو وہ علم سمجھ لیتے ہیں اور انفعالی طور پر اپنے حافظے میں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں"۔ (ص ۴۴-۴۵)

علم اور معلومات میں فرق :-

مندرجہ بالا تشریح کے بعد سید صاحب علم اور معلومات میں فرق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"اس طریقہ سے دماغ کی تربیت نہیں ہو سکتی وہ تو جب ہی ہوتی ہے جب ہم اپنے معنی خیز تجربوں سے فائدہ اٹھانا سیکھتے ہیں اور نئے، فکر انگیز اور حوصلہ آزما خیالات اور مسائل کے ساتھ جد و جہد کرتے ہیں۔ بعض استاد تو اکثر خود بھی نہیں جانتے کہ اس ذہنی جد و جہد کا کیا مطلب ہے اگر طلبہ کو کوئی بات معلوم نہیں ہوتی تو وہ انھیں اتنا موقع نہیں دیتے کہ وہ خود اس کو دریافت کریں بلکہ اپنے آپ بتا دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح (بقول ایک نکتہ داں کے) علم استاد کی نوٹ بک سے طالب علم کی نوٹ بک میں پہنچ جاتا ہے اور ان میں سے کسی کے بھی دماغ سے نہیں گزرتا لیکن جیسا میں نے کہا یہ علم نہیں یہ تو متفرق معلومات ہیں۔ بے شک زندگی میں ان کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن ان میں سے بیشتر آسانی سے حسب ضرورت حوالے کی کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ان کو حافظہ پر بار کیوں بنایا جائے؟ جب معلومات اور انکے باہمی رشتوں کو ذہانت کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے اس وقت وہ علم میں منتقل ہوتی ہیں لیکن علم بھی بجائے خود کافی نہیں جب تک ہم اس کو عقل میں تبدیل نہ کریں۔ عقل جس کو کسی مبصر نے علم کا وہ حاصل شگفتہ، کہا ہے اور جس کی روشنی سے فرد کی پوری شخصیت اور زندگی منور ہو جاتی ہے۔ جب تعلیم محض واقفیت بہم پہنچانے کے کاروبار تک محدود ہو جائے اور اس میں بہت سے کام کرنے والوں کو یہ بھی نہیں معلوم ہو کہ اس سے اونچی منزلیں بھی ہیں تو انجام ناکامی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔"

(ص ۴۵-۴۶)

یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے فرائض:

تعلیم کے نقائص کے اسباب کی تشریح کرتے ہوئے سیدین صاحب نے لکھا ہے:

"موجودہ صورت حال کا بہت کچھ نقص اس ذہنی آب و ہوا اور حالات کے جس میں ہمارے استاد کام کرتے ہیں بہت سی یونیورسٹیوں میں نہ تو ایک شعبہ کے استادوں میں حقیقی تبادلۂ خیال کا امکان ہے نہ مختلف شعبوں کے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

استادوں میں۔ ہر استاد کو بعض خاص پرچے دیدئے جاتے ہیں اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کو ختم کرے۔ میرے خیال میں اس ضمن میں اس لفظ کا استعمال ہی نہ صرف بے معنی ہے بلکہ خطرناک ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استاد کا یہ فرض نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ مقررہ درسی کتابوں کو ختم کرائیں یا ان میں جس قدر مباحث ہیں ان میں سے ہر ایک کا زود ہضم خلاصہ بنا کر طلبہ کے سامنے پیش کریں۔ ان کا کام طلبہ کے مطالعہ کو آسان کرنا نہیں بلکہ ان کی دلچسپی کو بڑھانا ان کے دماغ کو روشن کرنا ہے تاکہ وہ خود مطالعہ کرنا سیکھیں۔ اور اگر کہیں ایسی مشکل پیش آجائے جس کو طالب علم بالکل حل نہ کر سکے تو اس میں ان کی مدد کرنا ہے خود استادوں کے باہمی تعلقات بھی اس ضمن میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اکثر ان کا اپنے ساتھیوں سے بہت کم ذہنی اور علمی رابطہ ہوتا ہے۔ وہ باہمی دلچسپی کے مسائل پر اکثر بات چیت بھی نہیں کرتے بلکہ بعض تو اس کو خلاف شان سمجھتے ہیں مجھے ایسی بھی مثالیں معلوم ہیں کہ یونیورسٹی میں پڑھانے والے استاد برابر کے کمروں میں بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے سے لکھ کر بات چیت کرتے ہیں (بعض دفعہ اس نیت سے کہ ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیں)

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

بجائے اس کے کہ دو بدو گفتگو کریں برخلاف اس کے مجھے
بہت سی غیر ملکی یونیورسٹیوں میں جانے کا اور بعض میں
پڑھانے کا تجربہ ہوا ہے اور میں نے دیکھا کہ اکثر استاد
ایک دوسرے کے لکچر یا سیمینار میں بیٹھتے ہیں اور وہاں کی
بحث میں بلا تکلف شریک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں
ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اگر کبھی صدرِ شعبہ ایسا کرتا ہے تو
دوسرے استاد اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ بعض دفعہ افسوس
کے ساتھ ماننا پڑتا ہے، کہ ان کی ناپسندیدگی جائز ہوتی ہے
کیونکہ اس کا بنیادی محرک کوئی علمی یا تعلیمی جذبہ نہیں ہوتا
پھر بعض کالجوں اور یونیورسٹی میں استادوں کا تقرر اکثر
اپنے ہی پرانے طلبہ سے کیا جاتا ہے۔ اس کا نہ صرف یہ
نتیجہ ہوتا ہے کہ انتخاب کا حلقہ محدود ہو جاتا ہے اور بعض
دفعہ معیارِ انتخاب گر جاتا ہے بلکہ ایک اور بھی بڑا نقصان
ہے چونکہ ایک شعبہ کے بیشتر استاد ایک ہی یونیورسٹی کے
تعلیم یافتہ اور ایک ہی پروفیسر کے شاگرد ہوتے ہیں اس لئے
ان میں علمی افکار اور علمی اختلافات کے بارے میں آزادانہ
بحث و مباحثہ کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ خواہ ان کا مضمون
ادب ہو یا فلسفہ یا سائنس یا معاشیات اور اس طرح مضمون
کے مختلف گوشوں پر نئی روشنی نہیں پڑتی۔ اگر بحث بھی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہوتی ہے تو زیادہ تر صدر شعبہ یا سینئر استاد اس پر حاوی ہو جاتے ہیں اور گویا تحکمانہ انداز سے ہر مسئلے کا حل بیان کر دیتے ہیں۔ جونیئر استاد ان کے منصوبوں کو بغیر نقد و تنقید کے یا ناراض خاموشی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اختلاف رائے کا اظہار کریں گے تو شاید یہ چیز کسی وقت ان کی ترقی یا دوسرے مفاد کے خلاف پڑے یا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص طرز خیال شعبہ پر مستقل طور سے چھا جاتا ہے اور دوسرے مکاتیب خیال کی یا تو وہاں نمائندگی ہی نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے کبھی بحث ہوتی بھی ہے تو زیادہ تر ان اختلافات نظر کے بارے میں جو مثلاً انگریز یا جرمن یا روسی یا امریکن پروفیسروں میں پائے جاتے ہیں اپنے مفکروں اور معلموں کے اختلافات کے بارے میں نہیں۔ گویا ہمارا کام محض دوسروں کی دریافتوں اور نظریوں کو پیش کرنا ہے۔ خود آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرنا نہیں واقعہ یہ ہے کہ بعض پروفیسروں اور استادوں کی اپنی کوئی خاص علمی رائے ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے ذاتی نظریئے نہیں قائم کرتے، ان کی تنقیدی اور تحلیقی تفسیر نہیں کرتے اس کے لئے جرارت، ذہنی صلاحیت، آمادگی اور علمی حوصلہ پسندی کی ضرورت ہے تاکہ ہم تلاش حق کے سنسان راستے میں بے خطر سفر کر سکیں۔ ہر راہ پر خطر جو ہمت بھی بڑھاتی ہے اور پہاڑ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کی چوٹیوں پر پہنچنے تک انسان کو بے دم بھی کر دیتی ہے۔ برفیلی ہواؤں اور طوفانوں سے گھری ہوئی ہوتی ہے۔ ہم میں سے اکثر میں پیٹرک کیوانا گ کا وہ جذبہ بے پناہ نہیں جس نے کہا تھا: تاکہ میں اس چیز کو پا سکوں جو دماغ کی کال کوٹھڑیوں میں چند پیسے میں نہیں بکتی تاکہ میں ان ہاتھوں سے دوسرے دیسوں میں عقل کی روٹی توڑ سکوں اس امید میں بھوک کے چیتھڑے پہنے میں ایک نہ ختم ہونیوالے زینہ پہ چڑھتے جاتا ہوں۔

ہم میں سے بہت سے تو یہ پسند کرتے ہیں کہ برفیلی ہواؤں سے بچیں اور ایک خوشگوار آگ کے پاس آرام سے بیٹھے رہیں (گو ہم میں سے بیشتر کو سردی میں یہ آگ تک نصیب نہیں ہوتی) اور ان لوگوں کی صحبت میں اپنی زندگی گزاریں جن کا عمل جن کا طرز زندگی ہمارا جیسا ہے۔"

(ص-۴۷-۴۹)

سیدین صاحب نے اس ضمن میں برنارڈ اور میک شین BERNARD AND MAC SHANE کے خیالات دہرائے ہیں جنہوں نے وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ اس قسم کی بزدلی اور گھٹن کی فضا میں فلسفہ کا ہر مکتب فکر ایک ایسا کلب بن جاتا ہے جس کے ممبروں کو اس خیال سے اعتماد اور گرمی حاصل ہوتی ہے کہ دوسروں کا بھی وہی خیال

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ہے جو اپنا ہے۔ فرداً فرداً کوئی ممبر نہیں چاہتا کہ اس کو کلب سے باہر سردی میں چھوڑ دیا جائے اس لیے وہ ہجوم کی پیروی کرتا ہے۔ ان کی آواز کی صدائے بازگشت بن جاتا ہے جو بات سمجھ میں نہیں آتی اس کو بس یاد کر لیتا ہے۔ اس کے فوری مفاد اور تحفظ کے احساس کو اسی غلط فہمی سے تقویت پہنچتی ہے کہ سوال کا جواب کتاب میں موجود ہے۔ اس طرح سے علمی دنیا میں گھٹیا کم مایہ، حجی حضوری اشخاص پیدا ہوتے ہیں جن کو آجکل کی انگریزی اصطلاح میں ORGANISATION MAN کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح شروع میں تو کاروبار اور صنعت و حرفت کی دنیا کے لیے بنائی گئی تھی لیکن جب اس قسم کے اشخاص علمی دنیا میں جگہ پاتے ہیں تو وہ زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان میں نہ وہ ذہنی دیانت ہوتی ہے نہ جرأت جو اس میدان میں نہایت ضروری ہے۔ یہ تنقید بہت سی مغربی یونیورسٹیوں کے بارے میں کی گئی ہے۔ لیکن شاید یہ ہماری یونیورسٹیوں پر سختی سے عائد ہوتی ہے۔

سیدین صاحب یونیورسٹیوں کی اکیڈمک کونسل اور مختلف شعبوں اور مضامین کے ناگفتہ بہ حالات سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ مختلف شعبوں اور مضامین میں باہمی مکالمہ پر بہت زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف شعبے اپنے ماہانہ یا سہ ماہی جلسوں میں ایسا پروگرام رکھیں جس میں عام طور پر دوسرے شعبوں یا دوسری یونیورسٹیوں کے دو تین ممبروں کو شامل کیا جائے۔ سیدین صاحب کا خیال ہے کہ عام طور پر ان جلسوں کے ایجنڈا میں معمول کی بہت سی مدیں شامل ہوتی ہیں اور ان کو ایک مختصر وقت میں طے کرنا ہوتا ہے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اس لیے حقیقی تعلیمی مسائل پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہاں تک سال بہ سال نصاب پر نظر ثانی یا مناسب کتابوں کا انتخاب بھی ایک معمول بن جاتا ہے جہاں یا صدر شعبہ کا حکم چلتا ہے یا وہ تجویزیں جو بعض ممبر سرسری طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کو بغیر غور کے قبول کر لیا جاتا ہے اس سے وقت کی بچت ضرور ہوتی ہے لیکن دماغ پوچھتا ہے کہ یہ کس غرض سے ؟ اکیڈمک کونسل ایک اور ایسی جماعت ہے جہاں مختلف شعبوں کے مکالمہ کا امکان ہے لیکن اس کے ایجنڈا میں بھی عام طور پر معمول کے اور انتظامی مسائل اس قدر ہوتے ہیں کہ وہ بھی اس مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ لیکن یہ محض صورت حال کا تجزیہ ہے، اس کا حل نہیں۔ یہ یونیورسٹیوں کا کام ہے کہ غور کریں کہ اس کی اصلاح کیسے ممکن ہوتی ہے اور اپنے استادوں اور مختلف شعبوں میں معنی آفریں مفاہمت کی بنیاد کیسے ڈال سکتے ہیں؟ وہ کس طرح اپنی تعلیم کو ایک ایسی نئی سمت دے سکتے ہیں جس کی بدولت طلبہ میں زبان کے لیے اس کی سچائی اور دیانت کے لیے اس کی وضاحت اور اثر کے لیے اس کی قوت اور حسن کے لیے ایک شدید جذبہ پیدا ہو جائے کیونکہ اس کے بغیر کوئی مفید اور ثمر آور مکالمہ ناممکن ہے۔"

(ص ۴۹-۵۰)

زبان زندگی کو ذلیل کرنے کا ایک آلہ :-

سیدین صاحب کے نزدیک زبان کا مسئلہ استاد اور شاگرد کے درمیان

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کلاس روم کی چہار دیواری تک محدود نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

"یہ تو انسان کا ایک عالمگیر مسئلہ ہے، مردوں، عورتوں بچوں، جماعتوں، سماجوں اور قوموں کے لیے۔ ہم اپنی زندگی نہ صرف "بابل کے مینار" میں گزارتے ہیں بلکہ اکثر ایسی زبانیں بولتے ہیں جن کا سکہ بڑی حد تک کھوٹا ہو چکا ہے (اگرچہ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ جو نئے الفاظ، نئی نسل یا تحریکیں کسی زبان میں داخل کرتی ہیں ان کی وجہ سے لازماً یہ سکہ کھوٹا ہو جاتا ہے) جب زبان مسخ ہو جاتی ہے تو اس کو ریاکاری، دھوکا بازی، ظلم اور تصرف کا آلہ بنا لیا جاتا ہے۔ کروڑوں آدمی زبانوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں خلوص، دیانت، اعلیٰ خیالات اور شریفانہ جذبات کا کوئی احترام نہیں پایا جاتا۔ بہت سے معزز پیشے ایسے ہیں جن میں انسان زیادہ تر لفظوں کی تجارت کرتے ہیں جیسے وکیل یا مصنف استاد، مذہبی عالم، اشتہار دینے والے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اور تقریباً وہ سب لفظوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، ان کو کسی نہ کسی حد تک بے اصولی اور غیر ذمہ داری کے ساتھ برتتے ہیں"۔ (ص ۵۴)

اس سلسلے میں سیدین صاحب کے نزدیک سب سے زیادہ مورد الزام اشتہار باز اور سیاست کے کھلاڑی ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

"کیونکہ موجودہ زمانے میں ان گروہوں کا بہت زیادہ اثر اور رسوخ ہے۔ ان کے ہاتھ میں پرانے زمانے کے مطلق العنان راجوں اور مہاراجوں سے کہیں زیادہ قوت ہے۔ آپ اپنے اور دوسرے ملکوں کے اخبار اور رسالے پڑھیئے، ان میں نام نہاد لیڈروں کی تقریریں ان کے ایک دوسرے کے خلاف زہریلے اور بعض دفعہ بالکل جھوٹ بیان پڑھیئے، یا ان میں سے بعض کے ایڈیٹوریل پڑھیئے یا جنسی جرائم اور تشدد کی دل ہلا دینے والی خبریں پڑھیئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ زبان لوگوں کے درمیان باہمی مفاہمت اور پر امن تبادلۂ خیال کا پل نہیں بلکہ زندگی کو ذلیل کرنے کا ایک آلہ ہے ان میں سے بعض سیاسی شاطر کھلاڑیوں کے ہاں لفظوں کے معنی حسب ضرورت اتنی ہی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں جس طرح وہ اپنے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنی پارٹی یا اپنی پالیسی کو "بدلتے ہیں" "دل بدلنا" نہ صرف ان لوگوں کا سیاسی شیوہ بن گیا ہے بلکہ ان کے الفاظ کا بھی! جمہوریت، آزادی، سماجی انصاف، مساوات، رواداری تعصب، جنبہ داری، واقعیت، سچ، جھوٹ ان سب لفظوں کے وہ کوئی واضح اور معین معنی نہیں سمجھتے۔ ان سب کا مطلب خواہ ان کو تعریفی معنوں میں استعمال کیا جائے یا مذمت کے لیے اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کس پارٹی کی طرف ہیں۔ (ص ۵۴-۵۵)

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیّدین صاحب اس سلسلے میں کچھ افراد کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میں جانتا ہوں کہ ہر پارٹی میں کچھ ایسے افراد ہیں جو دیانت کا پاس کرتے ہیں، حسّاس ہیں، سچ کی زبان بولتے ہیں ان کو میں اس تنقید سے مستثنیٰ سمجھتا ہوں لیکن کس قدر کم ہیں۔ ٹیگور، گاندھی، نہرو، آزاد، رادھا کرشنن اور ذاکر جیسے انسان جن کی زبان میں سچ کی چاشنی اور دیانت کا جلوہ ہے؛ جن کے الفاظ لوگوں کو اونچا بھی اٹھا سکتے ہیں اور جب ضروری ہو سچ کی خاطر ان کو تازیانے بھی لگا سکتے ہیں۔" (ص ۵۵)

پاکستان سے سب سے بڑی شکایت

"لیکن میری سب سے بڑی شکایت

پاکستان کے خلاف یہ ہے کہ اس جنگ کو جو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی جنگ ہے جو مفادِ مخصوص کے تحفظ کے لیے لڑی جا رہی ہے، جو اہلِ قوت اور اہلِ دولت کو ان کے مقاموں پر مستحکم رکھنے کے لیے لڑی جا رہی ہے اس نے جہاد کا نام دیا ہے۔ اس نے اپنی پروپیگنڈہ مشنری کو نہایت قابلیت کے ساتھ جہاد کی ذہنیت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ جہاد اسلام میں بنیادی طور پر اس جد و جہد، اس کوشش اور اس سعی کا نام ہے جو راستی اور حق اور انصاف قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ بعض خاص صورتوں میں جہاد میں جنگ بھی شامل ہے لیکن جنگ جو دماغی طور پر صرف اپنی آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ مذہب، آزادیٔ عبادت کے تحفظ کے لیے کی جائے۔ جہاد میں دوسروں پر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ظلم شامل نہیں، دوسروں کو غلام بنانا شامل نہیں، ناحق کی مدافعت شامل نہیں۔ بنگلہ دیش میں ہزاروں آدمیوں کو تہ تیغ کرنا اور کروڑوں بندگانِ خدا کو دیس بدر کرنا شامل نہیں، لیکن اس ناعاقبت اندیش فوجی حکومت نے اپنا مقصد نکالنے کے لیے قوم پر خدا اور رسول، اور ائمہ اطہار کے پاک ناموں کو نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی لڑائی جو کسی مسلم اور غیر مسلم حکومت کے درمیان ہو وہ جہاد ہے۔ جو سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس نے اسلامی تاریخ کی ایک غلط اور مسخ شدہ تصویر دنیا کے سامنے پیش کی ہے کہ مسلمان تو جب بھی تلوار لے کر اٹھتے تھے خون کے دریا بہا دیتے تھے۔ کشتوں کے پشتے لگا دیتے تھے اور فرشتے اور بزرگانِ دین کی روحیں ان کے ہمرکاب ہوتی تھیں۔ اسلام نے جس قدر صلح و آشتی، امن اور سلامتی پر زور دیا ہے اس کی شاید ہی کوئی مثال ملے۔ لیکن ان مدعیانِ اسلام نے خود اپنے ہی مذہب کے ساتھ ایسا صریح ظلم کیا ہے جس کی مثال کم ملتی ہے اسلام نے سکھایا تھا کہ تمام مذہبوں کیساتھ رواداری اور عزت کا سلوک کرو اور قرآن شریف میں اور رسولِ خدا کی حدیثوں میں اس حکم کو بار بار دہرایا گیا ہے لیکن اس اسلامی ریاست کا ریڈیو بار بار ایسے پروگرام شائع کرتا ہے جس میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب پر ناشائستہ حملے کیے جاتے ہیں۔ اگر انہیں مذہب کا پاس اور سمجھ نہیں تو کیا اتنی سیاسی فہم بھی نہیں کہ اپنے لاکھوں بندگانِ خدا کے جذبات ہی کا احترام کریں جو ابھی چند روز پہلے تک ان کے شہری تھے۔ اسلام نے گفتگو میں نرمی اور شرافت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اور رواداری پر زور دیا تھا۔ لیکن ان کے پیروکاروں میں گالی گفتار اور غیظ و غضب کی ایسی ناپسندیدہ شکلیں دیکھنے میں آتی ہیں جس سے ذوقِ سلیم مجروح ہوتا تھا۔

(داستان اشک و خون ص ۱۳۰-۱۴۰)

ان سطور میں سیدین صاحب نے اسلام کے نظریۂ جہاد کی فاضلانہ تشریح کی ہے جہاد کے سلسلے میں مستشرقین بھی بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہیں اور افسوس کہ پاکستان کے ارباب حکومت مسلمان بھی۔ سیدین صاحب نے اس سلسلے میں صحیح اور حقیقی اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسلام کے اس نظریہ کی بھی تفسیر کر دی ہے جو وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں رکھتا ہے۔ قرآن شریف نے تو یہاں تک حکم دیا ہے کہ تم دوسروں کے "معبودان باطل" کو برا نہ کہو ایسا نہ ہو کہ وہ جواباً تمہارے معبود حقیقی کو برا کہنے لگیں۔

مسز اندرا گاندھی سیدین کی نظر میں :-

پاکستان کے ارباب حکومت کی دل آزار تقریروں پر تنقید کرتے ہوئے سیدین صاحب نے محترمہ اندرا گاندھی کی شرافتِ گفتار کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"اگر میں اپنے پاکستانی دوستوں سے اپیل کر سکتا (میں بھی وزیر اعظم کی طرح ان کے عوام کو دشمنوں کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتا) تو کہتا کہ آپ صدر یحییٰ خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کی تقریریں سنیے اور پھر جواہر لال نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کی

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

تقریریں سنئے اور بتائیے کہ اسلام کی سکھائی ہوئی شرافتِ گفتار کا ثبوت کس کی تقریروں میں ملتا ہے۔ خود کو مسلمان کہنا کافی نہیں، سچے مسلمانوں کا سا اخلاق اور کردار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔"

(ص ۱۴)

اسلام میں ظلم کی مذمت :-

سیدین صاحب ظلم کو اسلام کے نزدیک سب سے بُری چیز ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"دنیا میں سب سے بُری چیز ظلم ہے اور ظلم اور برائی سے روکنا انسان کا سب سے بڑا شرف ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کا ساتھ دے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔ انہوں نے حیران ہوکر پوچھا کہ ہم ناحق میں اپنے مسلمان بھائی کا ساتھ کیونکر دے سکتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ناحق میں ساتھ دینا یہ ہے کہ اس کو ظلم اور برائی سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ روس کے ایک مشہور ناول نویس نے لکھا ہے کہ دنیا میں سب سے اہم یہ چیز ہے کہ ناانصافی کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ بے شک ناانصافی ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے اور مستقبل میں بھی ہوتی رہے گی لیکن ایسا نہ ہو کہ اس

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کو جاری رکھنے میں تمہارا ہاتھ بھی شامل ہو۔

پاکستان کے اصلی دوست اور بہی خواہ وہ نہیں ہیں جو فوجی حکومت کی ظلم کی پالیسی میں اس کا ساتھ دیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ بلکہ وہ ہیں جو جرأت کے ساتھ ان کے ظالمانہ اور غیر دانشمندانہ اقدامات پر نکتہ چینی کریں اور ان کی مخالفت کریں۔ میں یہ سب کہتے ہوئے بھی خود کو خلوص کے ساتھ پاکستان کا بہی خواہ سمجھتا ہوں لیکن میرا یقین کامل ہے کہ مشرقی بنگال پر ان کی یہ ظلم وستم کی یورش، ان کے یہ جہاد کے نعرے، ان کا ہندستان کے خلاف نغمۂ نفرت، ان کے بعض لیڈروں کے بلند آہنگ لیکن احمقانہ دعوے کہ ہم دس سال نہیں، سو سال نہیں، ہزار سال تک جنگ جاری رکھیں گے۔ یہ سب ہم سے کہیں زیادہ ان کو نقصان پہنچائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندستان میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو پاکستان کے اس طرح ٹوٹ جانے پر خوش ہوں گے لیکن نہ ہمارے ملک کے ذمہ دار لوگ اس کے خواہشمند تھے نہ میں اس سے خوش ہوں لیکن یہ تباہی خود پاکستانی حکومت کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے آئی ہے اور اس کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہرانا محض خود فریبی ہے۔ فرمان الٰہی ہے "اور ڈرو اس فتنے سے کہ جب وہ اٹھے گا تو صرف وہی لوگ اس کی زد میں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

آئیں گے جنہوں نے خاص طور پر ظلم کیا ہے (بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے) مجھے اس بات کا انتہائی دکھ ہے کہ جس پالیسی کی ذمہ داری ایک محدود جماعت کے سر ہے اس کا خمیازہ ہمارے کروڑوں پاکستانی بھائیوں اور بہنوں کو اٹھانا پڑے گا۔" (ص ۱۴-۱۶)

مشرقی بنگال کا مسئلہ سیدین صاحب کی نظر میں:-

اس زمانے میں جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا تھا اس کو پاکستان کا ریڈیو اور اخبار وغیرہ یہ کہتے تھے کہ یہ ملک کا "اندرونی معاملہ" ہے۔ سیدین صاحب کے دل پر ایک حساس شخص کی طرح گہری چوٹ لگی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:-

"مشرقی پاکستان کا معاملہ کس طرح ایک اندرونی معاملہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو انسانیت کا معاملہ ہے، شرافت کا معاملہ ہے، انصاف کا معاملہ ہے فوجی ظلم و ستم اور بظاہر نسل کشی کو روکنے کا معاملہ ہے۔ چاہے بنگلہ دیش یا پاکستان کے ساتھ رہے یا نہ رہے پاکستان کی فوجی حکومت کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کے ساتھ خلاف انسانیت کا سلوک کرے۔"

(ص ۱۷-۱۸)

سیدین صاحب نے پاکستان کی سالمیت قائم رہ سکنے کے سلسلے میں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

"کیا اچھا موقع تھا پاکستان کی حکومت کے پاس کہ گفت وشنید کے دوران میں گزشتہ پالیسی کی غلطیوں کو ایمان داری کے ساتھ تسلیم کرلیتی (ایک دفعہ تو یادش بخیر بھٹو صاحب نے بھی از راہ مصلحت کہہ دیا تھا کہ بنگالیوں کے ساتھ ماضی میں زیادتی ہوئی ہے) اور آیندہ کے لیے انصاف کی پالیسی اختیار کرنی ہے۔ اس طرح شاید پاکستان کی سالمیت بھی قایم رہتی اور اس خون کے غسل کی نوبت بھی نہ آتی۔ دوستو! تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندوقوں اور توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ کروڑوں انسانوں کی محبت، وفاداری اور تعاون حاصل کیا گیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جبر وطاقت کے ذریعہ اس تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا جائے لیکن فوجی حکومت کی اس پالیسی نے پاکستان کی سالمیت پر جو ضرب لگائی ہے وہ ہندستان کیا تمام دنیا کے ملک مل کر بھی نہیں لگا سکتے۔ بنگالی تو اردو کم جانتے ہیں۔ اگر جانتے تو آپ کے شاعر فیض کے ان اشعار سے انہیں کس قدر تقویت ملتی ؎

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی"

(ص ۲۰ - ۲۱)

پاکستان سیدین کی نظر میں :-

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سیدین صاحب دو قومی نظریہ کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی تھی، یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین نے ایک خاص ڈبیٹ کا اہتمام کیا تھا جس میں حصہ لینے کے لیے کچھ مسلم مشاہیر کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ اس وقت ڈبیٹ کے لیے تجویز پیش کرنے کا فخر سیدین صاحب کو حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سیاسی مقصد کے حصول کے لیے ہندو اور مسلمان قدم ملا کے چلیں اور اپنی اپنی علیحدہ تنظیمیں قایم نہ کریں اور اسی طرح پورے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے متحدہ جد و جہد میں حصہ لیں۔ اس موضوع پر سیدین صاحب نے ایسی اثر آفریں تقریر کی کہ مجمع پر چھا گئے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر علی امام اور اور سر آغا خاں اس مجمع میں سربرآوردہ افراد کی حیثیت سے شریک تھے۔ ان سب نے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سیدین صاحب کے جذبات و خیالات کو ایک منچلے اور سر پھرے نوجوان کی ناتجربہ کاری اور خام خیالی پر محمول کیا اور ان حضرات کے شخصی اثرات سے سیدین صاحب کے خلاف کچھ آوازیں بھی اٹھیں۔ لیکن سیدین صاحب خاموش نہیں رہے۔ پھر جوابی تقریر کی اور ایسے دلائل پیش کیے جن کے وزن و وقار سے سارا مجمع متاثر ہوگیا۔ آخر میں جب ووٹ لیے گئے تو سیدین صاحب کی تجویز کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ اس وقت بانیٔ پاکستان جناح صاحب اپنی کھلی ہوئی شکست پر سخت حیران و پریشان تھے۔ مختصر یہ کہ سیدین صاحب شروع ہی سے قیام پاکستان کو ایک غیر مستحسن اقدام سمجھتے تھے۔ انہوں نے "پاکستان میری نظر میں" کے عنوان سے بنگلہ دیش میں ہونے والے واقعات کی روشنی میں جو خیالات پیش کیے ہیں وہ ان کی کتاب داستانِ اشک و خون کے آخری باب میں درج ہیں۔ اس باب کا آغاز اس طرح فرماتے ہیں:

"سوچتا ہوں کہ پاکستان کا ذکر کروں! اس اسلامی ریاست کا جس میں اسلام کے سچے اصولوں پر ریاست اور قومی زندگی کی تنظیم اور ترقی، سب شہریوں کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک کیا جاتا۔ کوئی دوسرے درجے کا شہری نہ ہوتا۔ دولت مند سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور مل مالکوں کی اجارہ داری نہ ہوتی، عوام آزادی کے ساتھ اپنی حکومت کا انتخاب کر سکتے ظالم مظلوم پر ظلم نہ کر سکتے۔ لیکن اس کے ذکر سے کیا فائدہ؟ اس اسلامی ریاست کا خواب تو کسی بھی عملی سیاست داں نے نہ دیکھا تھا بعض لیڈروں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

اور مفکروں نے زیب داستاں کے طور پر اس کا ذکر ضرور کیا تھا۔ یا اس پاکستان کا ذکر کروں جس کے بنانے کی کوشش قائد اعظم محمد علی جناح نے کی تھی۔ اور جب وہ قایم ہو گیا تو انہوں نے کہا تھا کہ اس نئے ملک میں مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے اور ان کے ساتھ ایک سا سلوک کیا جائے گا۔ اور جس کے دستور میں جمہوری حکومت کا تصوّر موجود تھا۔ لیکن وہ بھی ان کے بعد چند سال کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ اور اس پر فوجی حکومت کا تسلّط قایم ہو گیا جس میں نہ جمہوریت تھی، نہ مساوات۔ دولت کا بیشتر حصّہ چند خاندانوں میں سمٹ آیا اور مشرقی پاکستان کے ساتھ کہ بیشتر آبادی کا وطن تھا گویا ایک مفتوح نوآبادی کا سا سلوک کیا گیا جس کو نہ فوج اور سرکاری ملازمتوں میں کافی نمایندگی تھی نہ ملک کی دولت میں سے مناسب حصّہ۔ جس کو اس کی ترقی اور تعمیر میں صَرف کیا جا سکے، یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ اس کے مصدقہ اعداد و شمار خود پاکستان میں اور بین الاقوامی اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔"

(ص ۵۹ - ۶۰)

تقسیم ہند کے واقعہ کو ایک المیہ تسلیم کرتے ہوئے سیدین صاحب رقمطراز ہیں:۔

"تقسیم ہند کے المیے کے بعد جس میں دونوں ملکوں میں

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

خون کی ہولی کھیلی گئی مجھ جیسے امید پروروں کو یہ خوش فہمی تھی کہ رفتہ رفتہ دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات قایم ہو جائیں گے اور وہ اپنی تمام محنت اور وسائل کو تعمیری کاموں میں صرف کر سکیں گے۔ لیکن وہ بھی نہ ہوا بلکہ تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ گاندھی جی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جس مقصد کے حصول کے لیے ناپاک اور نامبارک ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں (اور نفرت اور خونریزی سے زیادہ نامبارک ذریعہ کیا ہو سکتا ہے) وہ مقصد بھی ذرائع کی ناپاکی سے ملوث ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں پاکستان کے اندرونی حالات بھی بدقسمتی اور قوت پرستی کی وجہ سے بگڑتے گئے اور نارمل صورت حال ابھی تک قایم نہیں ہوئی۔ آپ شاید کہیں کہ مجھے پاکستان کے اندرونی معاملات سے کیا تعلق؟ مجھے تعلق ہے! اوّل تو اس وجہ سے "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" ہر ملک میرا ملک ہے کیونکہ میرے خدا کا ملک ہے۔ دوسرے پاکستان کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک اسلامی ملک ہے اس دعوے کو تسلیم کرنے میں تو مجھے بہت تامل ہے لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کا ایک بڑا ملک ہے اور اس وجہ سے مجھے اس کے مستقبل میں دلچسپی ہے، تیسرے ہندستان اور پاکستان کی فلاح اور بہبود ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ جب تک دونوں میں رواداری اور دانش مندی کے تعلقات قایم نہ ہوں گے

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

ان میں سے ایک بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہمارے وسائل اور ذرائع سماجی اور معاشی تعمیر کے بجائے صرف جنگ کی تیاریوں میں تباہ اور برباد ہوتے رہیں گے۔ جیسا اب بھی بڑی حد تک ہو رہا ہے۔ پھر کیا اس پاکستان کی فوجی حکومت کا ذکر کروں جس نے پچھلے چند ماہ میں ظلم و جبر اور قتل و غارت کا وہ ریکارڈ قائم کیا ہے جس نے پاکستان کے مثالی تصور ہی کو نہیں بلکہ اس کے عملی تصور کو بھی خاک میں ملا دیا ہے جس نے لاکھوں بندگان خدا، مردوں، عورتوں بچوں، جوانوں، بوڑھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کو تہ تیغ کیا اور اسی لاکھ سے زیادہ انسانوں کو اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جس نے بنگال کے دانشوروں کو چن چن کر ہلاک کیا اور خبریں صحیح ہیں تو بے شمار عورتوں کی عصمت دری کی۔"

(ص ۶۰ - ۶۱)

پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر سیدین صاحب کی یہ صحت مند تنقید ارباب نظر کو دعوت فکر دیتی ہے۔ انہوں نے پاکستان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بھی الفاظ کی شرافتوں کا خون نہیں کیا ہے۔ اس باب کو انہوں نے ہمدردی اور خیر خواہی کے مندرجہ ذیل کلمات پر ختم کیا ہے:

"آپ یقین کریں کہ میں یہ بات بہت دکھ اور دل سوزی کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ پاکستان پھولے اور پھلے لیکن ایک شریف، باانصاف، انسانیت دوست ملک کی حیثیت

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سے وہ اپنی پالیسی اور طرزِ عمل سے اسلام کے اصولوں کی تصدیق کرے اپنے عمل سے ان کا مضحکہ نہ اڑائے۔ ان کی تحقیر نہ کرے۔ اسلام کے رخِ روشن پر سیاہی کا دھبّہ نہ لگائے۔ اس وقت پاکستان کی حکومت اور عوام کے سامنے ایک خوفناک سوالیہ نشان ہے جو آسمان پر انسانی خون کی روشنائی میں لکھا ہوا ہے۔ آپ کب تک اس کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں"

(ص ۶۶-۶۷)

سیدین ایک ہمعصر شاعر کی نظر میں :-

یوں تو اردو کے بہت سے ہمعصر شعراء نے ان کو ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن شمیم کرہانی کی نظم جس کا عنوان ہے "خواجہ غلام السیدین" خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ یہ نظم سیدین صاحب کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم میں شاعر نے نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ سیدین صاحب کی شخصیت کی جاذبیت و عظمت کو فکر و فن کے رنگ و آہنگ میں سمو دیا ہے ؎

نکہتِ صبحِ چمن، نورِ شبِ ماہ بہشت
غازۂ حسنِ قمر، رنگِ رخِ مہرِ منیر
نرمیٔ جوئے شفق، گرمیٔ احساسِ بشر
لے کے فطرت نے بنایا، تری ہستی کا خمیر

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

(۲)

نارسیدہ بہ زباں، حرف دل آرا تیرا
بوئے گل جیسے گل تازہ کے سینے میں ہو قید
تیرا پاکیزہ تصوّر، تری روشن تخیّل
جیسے شفاف فضاؤں میں رواں ابر سفید

(۳)

رونقِ محفلِ ہستی، ترے اخلاص کا دل
مشعلِ جادۂ ظلمت، تری دانش کا دماغ
دل ترا دولتِ عرفاں سے ضیا پاش ہے یوں
جیسے ضوبار ہو کاشانۂ منعم میں چراغ

(۴)

شکلِ خورشید، منوّر ترے دل کا شیشہ
مثلِ آئینۂ مصفّیٰ ترا شفاف ضمیر
تیری گفتار میں تنویرِ صداقت جیسے
جھلملاتی ہے محک پر زرِ خالص کی لکیر

(۵)

بکمالِ خرد و حکمت و فرہنگ و شعور
نوجوانوں کا جو ساتھی ہے تو بچوں کا ندیم
بذلہ سنجی کا یہ انداز یہ شوخی کا طریق

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

چھیڑ کر جیسے شگوفوں کو نکل جائے نسیم

(۶)

تیری ہستی کو مشیت نے عطا کر کے ہمیں
دلِ ظلمت میں تمنائے ضیا رکھی ہے
جہل کے جادۂ تاریک سے بچنے کے لیے
وقت نے علم کی اک شمع جلا رکھی ہے

(اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ۔ شمیم کرہانی۔
مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ص ۲۴)

سیدین صاحب اپنے احباب کی نظر میں :-

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سیدین صاحب احباب کی کثرت کے لیے مشہور تھے۔ ان کی وفات پر بہت سے احباب نے ان کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ہفتہ وار "سرفراز" لکھنؤ سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں :

سید حامد حسین رضوی عشروی نے سیدین صاحب کے اوصاف حمیدہ کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے سیدین صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور مذہبی معلومات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"مرحوم کا سب سے پہلے مجھ سے تعارف حضرت حجۃ الاسلام

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

سرکار نجم الملت اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے غالباً ۱۹۲۲ء میں فرمایا جبکہ میں اپنی ابتدائی سروس میں لکھنؤ آیا اور حسب معمول سرکار ممدوح و مغفور اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی زیارت کے لیے دولت کدہ پر حاضر ہوا اطلاع ہوئی سرکار ممدوح باہر اس حالت میں تشریف لائے کہ دست مبارک میں ایک خط تھا جسے ملاحظہ فرما رہے تھے اور مسکرا رہے تھے باہر تخت اور دری بچھی ہوئی تھی رونق افروز ہوئے مجھے بھی بٹھایا اور فرمایا کہ تم خواجہ غلام السیدین کو جانتے ہو جو خواجہ غلام الثقلین کے فرزند ہیں، لندن جا رہے ہیں جہاز پر راستہ میں ایک انگریز پادری سے مذہبی بحث چھڑ گئی اس کا خلاصہ لکھا ہے۔ بڑی قابلیت سے بحث کی۔ بڑی عمدہ اور معقول دلیلیں دی ہیں مجھے مسرت ہے کہ اس نوعمری میں ایسے پاکیزہ خیالات اور مذہبی جذبات ہیں خداوند عالم اور زیادہ ترقی دے۔"

(سرفراز لکھنؤ ۔ ۱۹۷۲ء ۱۷ جنوری)

سید مقصود حسین نقوی ایم۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (ایڈن) نے "خواجہ غلام السیدین صاحب کی زندگی کا مذہبی پہلو" کے عنوان سے سرفراز لکھنؤ (۲۵ جنوری ۱۹۷۲ء) میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں سیدین صاحب کی خصوصیت کے ساتھ مذہبی خدمات کا جائزہ لیا ہے سید وصی الحسن زیدی ایڈوکیٹ اناؤ ان کے طالب علمی کے زمانے کے ساتھی ہیں فرسٹ ایر سے لے کر بی۔ اے تک سیدین کے ہم سبق رہے انہوں نے "خواجہ غلام السیدین

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کی زندگی کی چند جھلکیاں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں طالبعلمی سے وفات تک کے واقعات جستہ جستہ بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ولایت کے دوران قیام میں وہاں بھی کوئی ڈبیٹ ہوئی تھی جس میں وہاں کے وزیر اعظم کی مخالفت میں انہوں نے تقریر کی تھی اور وہ بھی ان کی موافقت میں طے ہوئی تھی۔"

سیدین کی مذہبی زندگی کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے:

"ولایت کے دوران قیام میں سیدین کا ایک خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ نماز ظہرین و مغربین تو بہ آسانی پڑھ لیتا ہوں مگر صبح کی نماز کے لئے کیا کیا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ نہ تیمم کے لیے مٹی ملتی ہے اور بوجہ سردی نلوں میں پانی جم جاتا ہے لہذا وضو کے لیے پانی بھی نہیں مل سکتا۔ اس سے مرحوم کی مذہبی زندگی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

سیدین صاحب نے اقبال کا یہ خیال عمل سے ثابت کر دکھایا ہے

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

دوستوں سے محبت اور بے تکلفی کے سلسلے میں ایک واقعہ لکھا ہے:-

"نواب صاحب رام پور مرحوم شیعہ کالج ٹکنیکل فنڈ کا چندہ

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

جمع فرما رہے تھے۔ اکابرین قوم پیپلز ہاؤس لکھنؤ میں جمع تھے۔
نواب صاحب مرحوم، کرنل بشیر حسین صاحب زیدی اور
سیدین مرحوم ایک جگہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت
تک میرا کوئی خاص تعارف نواب صاحب رامپور سے نہ تھا۔
میں نے فقط سیدین کہہ کر مخاطب کیا۔ نواب صاحب مرحوم
نے سنا اور فرمایا کہ بہت بدتمیز انسان ہیں کہ جو نہ خواجہ صاحب
کہہ کر نہ غلام السیدین کہہ کر پکار رہے ہیں۔ کرنل زیدی نے
میرا تعارف کرایا اور سیدین نے کہا سرکار ہندستان میں دو ہی
تین میرے خاص احباب ہیں جو مجھے فقط سیدین کہہ کر ہی
پکارتے ہیں اور انہیں کو یہ حق حاصل ہے کہ سیدین کہہ کر
پکاریں۔" (سرفراز لکھنؤ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۲ء)

میں نے یہاں ان کے چند ہم مذہب احباب کے مضامین کے اقتباسات
پیش کیے ہیں۔ ان کے ملکی اور غیر ملکی احباب کے ان کے بارے میں خیالات
درج کرنے کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے جس کی فی الحال یہاں گنجائش
نہیں۔ لہذا مجھے سعدی کی زبان میں یہ معذرت کرنا پڑ رہی ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

وہ اپنی شان تصنیف کی رنگا رنگی اور ذوق فکر کی بوقلمونی کی وجہ سے
عالمگیر شہرت کے مالک تھے ان کی تصانیف کی انفرادی شان نے ان

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

کے حلقۂ احباب کو مزید وسیع کر دیا تھا۔

غرض سیدین صاحب کی ہر تصنیف خواہ وہ آندھی میں چراغ ہو یا فکرِ انسانی کا سفر ارتقا یا زبان زندگی اور تعلیم اسی طرح کے افکار و خیالات بکھرے ہوئے ہیں۔ فرانس کے فلسفی روسو نے اپنی کتاب امیل (EMELE) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے الفاظ میں تناقض ہو سکتا ہے لیکن میرے خیالات میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ یہی بات سیدین صاحب کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔

سیدین صاحب کی ذات میں وہ سب صفات جمع تھیں جنہیں قدیم دانایانِ ہند نے ستیم (حق) شِوم (قوت تخلیق) اور سندرم (حسن) سے تعبیر کیا ہے۔

میں نے حتی الامکان ان کی خوبیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی ان کی روح سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

مرحوم سے میرے ایک عرصۂ دراز سے تعلقات تھے۔ ان کی موت سے میں کتنی سعادتوں سے محروم ہو گیا ہوں یہ میں ہی جانتا ہوں ؎

تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنج ہائے سعادت زیاں چناں آمد

Formal Inauguration
Compliments
Of the Department of Culture
Government of India

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

Gurukul Kangri Library
Acc. No.
Class No.
G.L. No.
Tag etc
Checked
Any Other

Entered in Database
Signature with Date

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

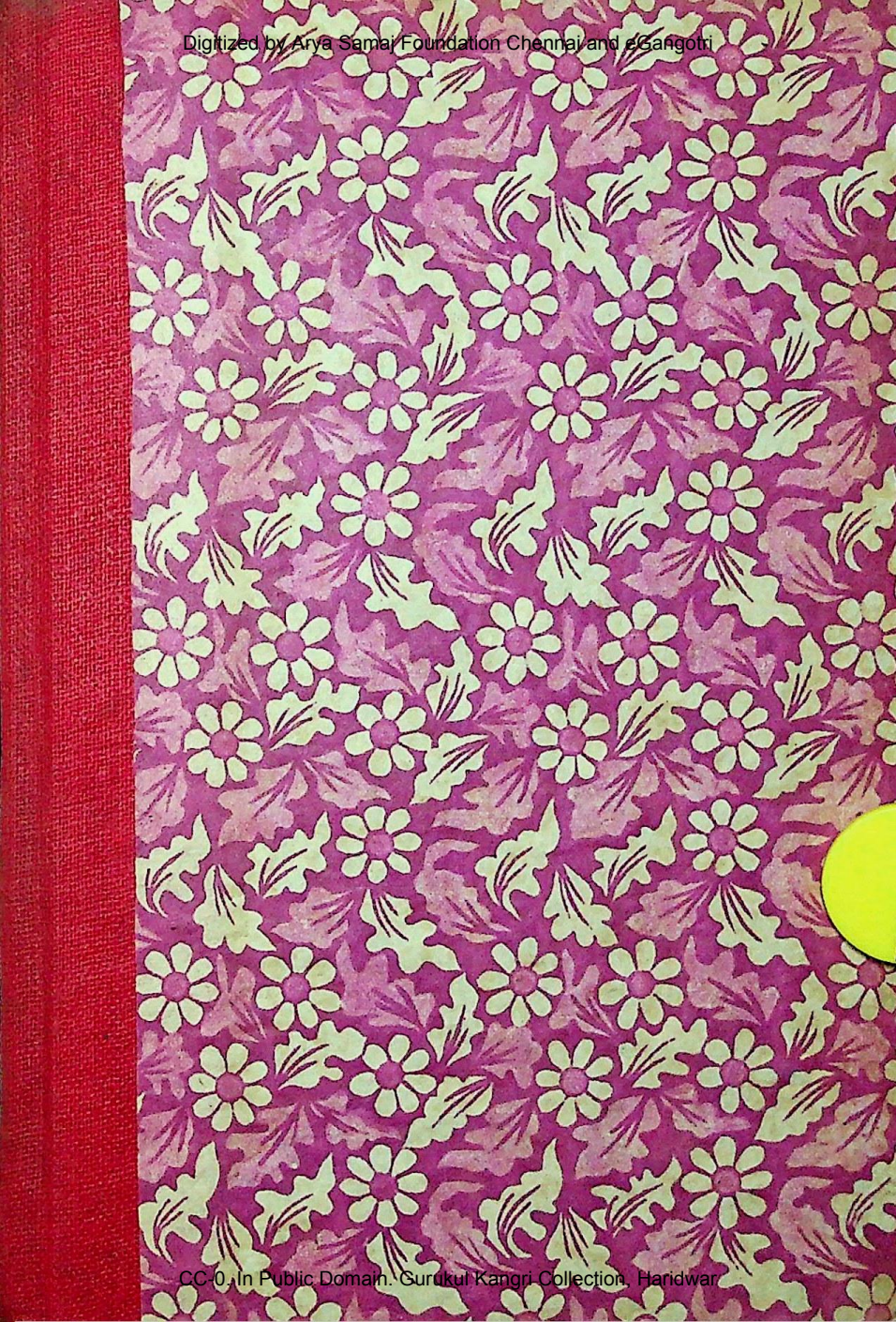

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar

Digitized by Arya Samaj Foundation Chennai and eGangotri

3733

CC-0. In Public Domain. Gurukul Kangri Collection, Haridwar